رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۰

جلد (۱۰) عدد (۵)

۵۶ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)
قیمت فی پرچہ (۸؍)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابو الاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شد و مد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی! اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابو الکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب بودھ مت مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو ہی بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت صفحات قیمت جلد (للعہ) انگریزی (اللعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت ... انگریزی ... سکہ عثمانیہ!

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علیہ چار مینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۶ھ جلد ۱۰ - عدد ۵ -

اعلان

ایک صاحب خیر رئیس نے دفتر ترجمان القرآن کو ۲۵ - روپے عنایت کئے ہیں تاکہ چند غیر مستطیع آدمیوں کے نام رعایتی چندہ سے پرچہ جاری کر دیا جائے - لہٰذا جو اصحاب اس رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہیں وہ دو روپے آٹھ آنے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں - پرچہ ایک سال کے لیے ان کے نام جاری کر دیا جائیگا -

منیجر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِشارات

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۔ (الاعراف ۔ ۱)

پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف خدا کے پاس سے نازل کی گئی ہے ۔ خدا کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرنے لگو ۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۔ (آل عمران ۔ ۴)

اے نبی کہدو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تمکو دوست بنالے گا اور تمہیں بخش دیگا ۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۔ (الاحزاب ۔ ۳)

تمہارے لیے یقیناً اللہ کے رسول میں عمل کا اچھا نمونہ موجود ہے جو کوئی اللہ کی رحمت کا امیدوار ہو، اور روز آخرت کے آنے کی توقع رکھتا ہو اس کے لیے (وہی پیروی کا صحیح نمونہ ہے)

جو لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں یا جنہوں نے کبھی قرآن پڑھا ہے ۔ ان کی نظر سے اس کتاب پاک میں یہ آیات ضرور گذری ہوں گی ۔ بہت سوں کو ان کے معانی سے بھی واقفیت ہوگی ۔ خصوصاً آخری آیت سے تو کوئی وعظ اور کوئی اصلاحی خطبہ خالی نہیں ہوتا ۔ مگر آج ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایک بار پھر یہ آیات نظروں کے سامنے لائی جائیں ، کیونکہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ شائد ساری مسلمان قوم ان آیات کو بھول گئی ہے ۔

مجملاً ہر مسلمان اس بات کو جانتا اور مانتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم کو قرآن اور اسوۂ رسول ہی کا اتباع کرنا چاہیے۔ اور ہمارے لیے ہدایت انہی دونوں چیزوں میں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہدایت جس کے اتباع کا حکم اس قطعیت کے ساتھ تم کو دیا گیا ہے، آیا اس کا دائرہ صرف طہارت اور استنجا اور عبادات اور (باصطلاح زمانۂ حال) "مذہبی" معاملات ہی تک محدود ہے یا تمہاری زندگی کے چھوٹے اور بڑے، دینی اور دنیوی، قومی اور ملکی تمام معاملات پر حاوی ہے؟ نیز یہ ہدایت صرف اس زمانہ اور اس ملک کے لیے تھی جس میں قرآن نازل ہوا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے، یا درحقیقت یہ زمانی و مکانی قیود سے مبرا ہے اور اس میں ہر زمانے اور ہر ملک کے مسلمانوں کے لیے ویسی ہی سچی اور صحیح رہنمائی موجود ہے جیسی ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے عربوں کے لیے تھی؟ اگر پہلی بات ہے، تب تو نعوذ باللہ قرآن کا یہ مطالبہ ہی غلط ہے کہ سب رہنماؤں کو چھوڑ کر صرف اُسی کی پیروی کی جائے، اور تمام دنیا کے طریقوں کو ترک کرکے صرف اس ایک شخص کے اسوہ کا اتباع کیا جائے جو ہمارے پاس قرآن لایا تھا۔ اس صورت میں تو اتباع کرنے کے بجائے تم کو اپنے ایمان ہی پر نظر ثانی کرنی پڑے گی لیکن اگر بات دوسری ہے، تو یہ کیا ماجرا ہے کہ تم وضو اور غسل کے مسائل میں، نکاح اور طلاق کے معاملات میں، ترکے اور وراثت کے مقدمات میں تو اُس سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرتے ہو، مگر جن مسائل کے حل پر تمہاری قوم کی زندگی و موت کا مدار ہے، ان میں نہیں دیکھتے کہ قرآن تمہیں کونسا راستہ دکھاتا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کس طرف تمہاری رہنمائی کرتی ہے۔

ہندوستان میں ہر طرف ایک بے چینی نظر آتی ہے۔ ساری مسلمان قوم پر ایک پریشانی چھائی ہوئی ہے مستقبل کا سوال ایک درشتی ہنڈی کی طرح مسلمان کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے اور تقاضا کر رہا ہے کہ یا تو میرا معاملہ صاف کرو یا دیوالہ نکالو۔ لیکن اس قوم کا حال کیا ہے؟ جس کا جدھر منہ اٹھ رہا ہے چلا جا رہا ہے اور جس کے ذہن میں جو بات آرہی ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ کوئی مارکس اور لینن کے اُسوے کی

دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے کوئی ہٹلر اور مسولینی کی سنت پر عمل کر رہا ہے کوئی گاندھی اور جواہر لال کے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ کوئی فرائض کی پرانی فہرست میں ایک نئے فرض کا اضافہ کر رہا ہے۔ کسی پر نشستوں اور ملازمتوں کے فی صدی تناسب کا بھوت سوار ہے۔ کوئی حرکت اور عمل کا پجاری بنا ہوا ہے اور ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ اگر پشاور کی گاڑی نہیں چلتی تو راس کماری ہی کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہو جاؤ، اس لیے کہ منزل مقصود کوئی نہیں، حرکت ہی فی نفسہ مقصود ہے۔ غرض ہر شخص جو کچھ بول سکتا ہے ایک نئی تجویز قوم کو سنا دیتا ہے۔ اور ہر شخص جو کچھ لکھ سکتا ہے ایک ماہرانہ و مبصرانہ مقالہ لکھ کر شائع کر دیتا ہے۔ مگر اس تمام شور و شغب اور اس پورے ہنگامے میں کسی کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ ہمارے پاس قرآن نامی بھی کوئی کتاب ہے جس نے زندگی کے ہر مسئلہ میں ہماری رہنمائی کا ذمہ لے رکھا ہے، اور ہم سے کبھی یہ بھی کہا گیا تھا کہ زندگی کے ہر معاملے میں تمہارے لیے ایک عملی نمونہ موجود ہے۔

مسلمانوں کو مختلف راستوں کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ ہر راستہ کی طرف بلانے والوں میں بڑے بڑے مقدس علماء ہیں۔ بڑے بڑے نامور لیڈر ہیں۔ بڑے بڑے زبان آور خطیب اور ماہر فن انشا پرداز ہیں۔ ہر وادی کے سرے پر ایسے لوگ کھڑے ہیں جن کی آزمودہ کاری مسلّم، قومی خدمات ناقابل انکار، اور سیاسی مہارت و بصیرت معروف و مشہور ہے۔ ہر رہنما بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے اپنے راستے کے نشیب و فراز دکھا رہا ہے اور دوسرے راستوں کے خدشات بیان کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ بہت قابل قدر ہے۔ مگر مسلمان کی فطرت کہتی ہے کہ ائتونی شیئاً من کتاب اللہ وسنۃ رسولہ حتیٰ اقول۔ میرے سامنے شخصیتوں کو نہ لاؤ۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، عالم و فاضل ہو، مفسر قرآن ہو، معلم حدیث ہو، ماہر سیاست ہو، عمل اور قربانی کا نمونہ ہو، اس کی حرمت میرے سر اور آنکھوں پر، مگر جو ہدایت وہ دے رہا ہے، اگر وہ اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے تو میرے لیے لائق اتباع نہیں۔ ہاں اگر وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ

ہیں سے کوئی دلیل اپنے پاس رکھتا ہے تو شخصی عظمت کی آمیزش سے الگ کر کے اس کو اور صرف اس کو سامنے لاؤ، اس لیے کہ وہی لائق اتباع ہے، اسی میں سچی ہدایت ہے اور اسی کی پیروی میں صلاح و نجات ہے۔ اس کے بتائے ہوئے راستے میں خواہ کتنے ہی خدشات ہوں، کتنی ہی دشواریاں اور کتنے ہی نقصانات ہوں، آخری اور دیرپا اور یقینی کامیابی اسی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آئیے آج اسی نقطۂ نظر سے قرآن اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر غور کریں کہ ہمارے اس وقت کے قومی مسائل میں اس کے اندر کیا ہدایت ہے۔ کچھ پروا نہیں اگر کوئی اس کو دقیانوسیت اور رجعت پسندی کہہ کر ناک بھوں چڑھائے۔ حالات جدید سہی، مسائل وقتی سہی، جغرافی ماحول مختلف سہی۔ مگر جس ہدایت کی طرف ہم رجوع کر رہے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہر زمانے میں جدید ہے، ہر دور میں وقتی ہے، اور ہر جغرافی ماحول میں مقامی ہے۔

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت آپ کے وطن کی سیاسی حالت کیا تھی اور اس حالت میں آپ نے کیا طرز عمل اختیار کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت عرب ہر طرف امپیریلسٹ طاقتوں سے گھرا ہوا تھا اور خود ملک کے اندر ہمسایہ قوموں کا امپیریلزم نفوذ کر چکا تھا۔ آپ کی پیدائش سے چند ہی روز پہلے حبشی فوجیں یلغار کرتی ہوئی خاص اس شہر تک پہنچ گئی تھیں جس میں آپ پیدا ہوئے۔ عرب کا سب سے زیادہ زرخیز صوبہ یمن، پہلے حبشیوں کے اور پھر ایرانیوں کے تسلط میں جا چکا تھا۔ عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل ایرانیوں کے زیر اثر تھے۔ عراق عرب کا علاقہ نجد کے حدود تک ایرانیوں کے اثر میں تھا۔ شمال میں عقبہ و معان تک بلکہ تبوک تک سلطنت روم کے اثرات پہونچے ہوئے تھے۔ دونوں ہمسایہ سلطنتیں عرب کے قبائل کو اپنی اغراض

کے لیے ایک دوسرے سے لڑاتی تھیں اور اندرون عرب میں اپنے اثرات پھیلا رہی تھیں ۔ متعدد مرتبہ قسطنطنیہ کا قیصر مکہ کی چھوٹی سی ریاست کے معاملات میں مداخلت کر چکا تھا ۔ عربی قوم کو ہر ملک گیر طاقت اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی، کیونکہ اس قوم کا ملک بنجر تھا، مگر قوم بنجر نہ تھی ۔ جہانگیری کے لیے بہترین سپاہی اس سے فراہم ہو سکتے تھے ۔

ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے کیا کیا ؟ اگرچہ آپ کو اپنے وطن اور اپنی قوم سے فطری محبت تھی، اور آپ سے بڑھ کر حریت پسند کوئی نہ تھا، مگر آپ نے ایک قوم پرست (Natianalist) یا وطن پرست (Patriot) کی حیثیت اختیار نہ کی بلکہ ایک حق پرست اور خدا پرست کی حیثیت اختیار کی ۔ آپ کی نگاہ میں مقدم کام یہ نہ تھا کہ اپنے اہل وطن کی قوت کو مجتمع کر کے اجنبی استیلا کی جڑیں خاک وطن سے اکھاڑ پھینکیں بلکہ ہر دوسرے کام سے مقدم یہی تھا کہ حق پرستوں کا ایک جتھا بنائیں اور اس کے اندر ایک ایسی طاقت پیدا کر دیں کہ وہ صرف عرب میں نہیں بلکہ خود روم و ایران میں بھی ظلم و عدوان کے استیلا کا خاتمہ کر دے ۔ آنحضرت کے اہل وطن آپ کے بہترین اوصاف سے واقف تھے ۔ انہوں نے عرب کی بادشاہی کا تاج آپ کے سامنے پیش کیا تھا اس شرط پر کہ آپ اپنے اس جتھے کی توسیع و تنظیم سے باز آجائیں ۔ اگر آپ وطن پرست ہوتے تو خدمت وطن کا اس سے بہتر موقع اور کونسا ہو سکتا تھا ۔ مگر آپ نے اس تاج کو ٹھکرا دیا، اور اسی کام میں لگے رہے جس کے بارآور ہونے کی کم از کم اس وقت کوئی شخص امید نہ کر سکتا تھا ۔ اس وقت آپ کی جمعیت دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی ۔ تمام ملک میں کوئی قبیلہ اور کوئی گروہ آپ کا ساتھی نہ تھا بلکہ سب مخالف اور سخت مخالف تھے ۔ ظاہر اسباب کے لحاظ سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اسکیم کب کامیاب ہوگی جس کو آپ لے کر اٹھے تھے ۔ اس بات کا ہر وقت امکان تھا کہ واقعہ فیل کی طرح کا کوئی دوسرا واقعہ پھر پیش آجائے اور حجاز بھی یمن اور ارض غسان

کی طرح اجنبی حکومت کا غلام بن جائے۔ مگر آپ نے ہر حال میں یہی ضروری سمجھا کہ پہلے حق پرستوں کی جمعیت کو بڑھائیں اور مضبوط کریں، پھر جیسی صورت حال ہو اس کے مطابق ملکیوں اور غیر ملکیوں کے ساتھ کوئی معاملہ کریں۔

اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا آپ "کیونلسٹ" تھے؟ کیا آپ نعوذ باللہ اپنے وطن کے غدار تھے؟ کیا خاکم بدہن آپ غیر ملکی امپیریلزم کے ایجنٹ تھے؟ ہرگز نہیں۔ تاریخ کے ناقابل انکار حقائق گواہ ہیں کہ کسی فرزند وطن نے اپنے وطن کو اتنی سربلندی عطا نہیں کی جتنی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت عرب کو نصیب ہوئی۔ اور تاریخ ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ کسی داعی دین نے غیر مذہب والوں کے ساتھ اتنے تحمل، اتنی فیاضی، اتنی رواداری اور اتنی فراخ حوصلگی کا برتاؤ نہیں کیا۔ پھر یہ بھی دنیا کو معلوم ہے کہ اللہ کے رسول نے کبھی روٹیوں کی تقسیم اور منافع کے بٹوارے کا سوال ہی نہیں اٹھایا۔ آپ نے نہ کبھی مکی زندگی میں اس بنیاد پر مصالحت کی کہ ریاست قریش کے دار الندوہ اور جنگی و سیاسی عہدوں میں مسلمانوں کی اتنی نمائندگی ہو، اور نہ مدنی زندگی میں اس مسئلہ کو مدار صلح قرار دیا کہ یہود کے معاشی وسائل میں مسلمانوں کا اتنا حصہ ہو۔

اب غور کیجیے کہ جب وہاں کیونلزم تھا نہ وطن دشمنی تھی نہ اعدائے وطن سے سازباز تھا، تو پھر کونسی چیز تھی جس کی بنا پر آپ نے عرب کی سیاسی نجات اور تمدنی و معاشی ترقی پر اپنی بہترین توتوں اور قابلیتوں کو صرف کرنے سے انکار کیا اور ہر کام سے پہلے خدا کا نام لینے والوں کی ایک طاقت ور جمعیت بنانا اور زمین میں اس کا دبدبہ قائم کرنا ضروری سمجھا؟ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین وطن پرستوں کے نصب العین سے بالکل مختلف تھا۔ اس نصب العین کی راہ میں باہر کے قیصر و کسریٰ اور گھر کے ابوجہل و ابولہب دونوں یکساں سد راہ تھے۔ اس نصب العین کو

حاصل کرنے کے لیے ناگزیر تھا کہ واقعات کی رفتار اور ملک کے مستقبل اور آئندہ کے امکانی خدشات سب کی طرف سے بے پروا ہو کر ایک ایسی جماعت کو منظم کیا جائے جو باطل کے غلبہ کو کسی صورت میں قائم نہ رہنے دے اور اپنی طاقت سے زمین میں ایسی حالت قائم کر دے جس میں خدا پرستانہ تہذیب امن کے ساتھ پھل پھول سکے حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

وہی نصب العین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان قوم کو دے گئے ہیں۔ مسلمان قوم ایک قوم ہی اس بنیاد پر بنی ہے کہ یہ نصب العین اس کے تمام افراد کا مشترک اور واحد نصب العین ہے۔ اس نصب العین کو سلب کر لیجیے پھر مسلمان قوم کسی قوم کا نام نہیں ہے۔ یہاں عرب اور عجم کی کوئی خصوصیت نہیں زمان و مکان کا کوئی سوال نہیں۔ مسلمان اگر مسلمان ہے تو ہر حال میں یہی اس کا نصب العین ہے۔

اب ایک دوسری نظر اسی کتاب ہدایت اور اسی سیرت پاک پر ڈالیے۔

یہ جتھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا، اس کی بنیاد کسی مادرِ وطن کی فرزندی کسی نسل کے انتساب، کسی سیاسی و معاشی مفاد کے اشتراک پر نہ تھی، بلکہ ایک مخصوص عقیدے اور ایک مخصوص طرز عمل پر تھی۔ اس کو جوڑنے والی طاقت خدا کی محبت اور بندگی تھی نہ کہ اغراض کی محبت اور مادی مقاصد کی بندگی۔ اس کی طرف لوگوں کو بلانے والا نعرہ 'اذان' کا نعرہ تھا نہ کہ وطنیت کا نعرہ۔ اس کے اجزا کو سمیٹ کر ایک بنیان مرصوص بنانے والی چیز ایک ان دیکھے خدا کی عبادت تھی نہ کہ کوئی محسوس مرئی علامت۔ اس کو حرکت میں لانے والی چیز رضائے الٰہی کی طلب تھی نہ کہ منافع مادی کی طلب۔ اس میں عمل کی گرمی پھونکنے والی قوت اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش تھی نہ کہ نسل و وطن کو سربلند کرنے کی تمنا۔ اس قوم کے نفسیات دنیا سے نرالے ہیں۔ جو چیزیں دوسروں کو جمع کرنے والی ہیں وہ اس قوم کو منتشر کر دینے والی ہیں۔ جو صدائیں اپنے اندر دوسروں

کے لیے غیر معمولی کشش رکھتی ہیں وہ اس قوم کے دل میں الٹی نفرت پیدا کردیتی ہیں جن بری علامتوں پر دوسرے گرویدہ ہوتے ہیں یہ ان کے لیے کوئی جذبۂ عقیدت اپنے اندر نہیں پاتے جن چیزوں میں دوسروں کو گرما دینے کی طاقت ہے وہ ان کے دلوں میں الٹی سردی پیدا کردینے کا اثر رکھتی ہیں، جو چیزیں دوسروں کو عمل پر ابھارنے والی ہیں وہی ان کو میدان عمل سے دور بھگانے والی ہیں۔ سارے قرآن کو اٹھا کر دیکھ جاؤ۔ پوری سیرت نبوی پر نظر ڈال لو۔ خلافت راشدہ کے دور سے اس زمانہ تک کی اسلامی تاریخ پڑھ لو۔ تم کو معلوم ہو جائیگا کہ اسلام کی فطرت کیا ہے اور مسلمان قوم کا مزاج کس قسم کا ہے۔ جو قوم اس سوال پر صدیوں سے جھگڑ رہی ہے کہ نبی پر سلام بھیجتے وقت بھی کھڑا ہونا چاہیے یا نہیں، کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ "بندے ماترم" کا گیت سننے کے لیے تعظیماً کھڑی ہوگی؟ جس قوم کے دل میں مرئیات سے عقیدت کے بجائے سخت نفرت بٹھائی گئی ہے کیا تمہیں امید ہے کہ وہ کسی جھنڈے کو سر جھکا کر سلامی دے گی؟ جو قوم تیرہ سو برس تک خدا کے نام پر بلائی جاتی رہی ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ اب وہ بھارت ماتا کے نام پر پروانہ وار دوڑتی چلی آئے گی؟ جس قوم کے دل میں عمل کی گرمی پیدا کرنے والا داعیہ اب تک محض اعلائے کلمۃ اللہ کا داعیہ رہا ہے، کیا تمہارا گمان ہے کہ اب معدے اور بدن کے مطالبات اس میں حرارت پھونکیں گے، یا کونسلوں کی نشستوں اور ملازمتوں کے تناسب کا سوال اس کے قلب و روح کو گرما دے گا؟ جس قوم کو عقیدے اور عمل کی وحدت پر جمع کیا گیا تھا، کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ سیاسی اور معاشی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر کوئی طاقت ور عملی قوم بن جائے گی؟ تخیل کی بنیادوں پر نظریات کی عمارتیں اٹھانے والے جو چاہیں کہیں۔ مگر جس کسی نے قرآن اور سنت سے اسلام کے مزاج کو سمجھا ہے وہ بادنیٰ تامل یہ رائے قائم کرسکتا ہے کہ مسلمان قوم کی فطرت جب تک بالکل مسخ نہ ہو جائے، وہ نہ تو ان محرکات سے حرکت میں آسکتی ہے اور نہ ان جامعات کے ذریعہ سے جمع ہو سکتی ہے۔ غیر مسلم بلاشبہ ان ذرائع سے جمع ہو جائیں گے اور ان میں حرکت بھی ان محرکات سے پیدا ہو جائے گی کیونکہ ان کو جمع کرنے اور حرکت میں لانے والی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ ان کا مذہب

انہیں منتشر کرتا ہے اور صرف وطن کی خاک ہی ان کو جمع کرتی ہے۔ ان کے معتقدات ان کے دلوں کو سرد کرنے والے ہیں۔ ان میں حرارت صرف معدے ہی کی گرمی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ کو مگر مسلمان جس کو خدا کے نام پر جمع کیا گیا تھا اور جس میں ایمان کی گرمی پھونکی گئی تھی، آج تم اس کو ذلیل مادی چیزوں کے نام جمع نہیں کرسکتے اور نہ ادنیٰ درجہ کی خواہشات سے اس میں حرارت پیدا کرسکتے ہو۔ اس طریقہ میں اگر تم کو کامیابی نصیب بھی ہوسکتی ہے تو صرف اس وقت جبکہ تم مسلمان کو فطرت اسلام سے ہٹادو اور اسے بلندیوں سے گرا کر پستیوں میں لے آؤ۔

اس کے معنی یہ نہ سمجھو کہ مسلمان وطن کا دشمن ہے۔ ہرگز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن کی اصلاح و ترقی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ خلفائے راشدین نے وطن اور ابنائے وطن کی کیا کچھ کم خدمت کی؟ بعد کے مسلمان جس جس ملک میں گئے کیا انہوں نے اس کو جنت بنا کر نہیں چھوڑا؟ غیر مسلم قوموں کے ساتھ فیاضانہ معاملہ کرنے میں کیا کبھی کوئی کوتاہی کی گئی؟ پس اوپر ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے ملک یا اپنی قوم کے معاشی اور تمدنی مسائل سے بالکل بے پروا ہے۔ بلکہ ہم یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان کی اصلی قوتِ محرکہ یہ چیزیں نہیں ہیں، اس کی جمعیت ان بنیادوں پر قائم نہیں ہوئی ہے۔ اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے والی چیز یہ نہیں ہے۔ وہ ملی قوت اور منظم ہونے کے بعد ان سب مسائل کو حل کرنے میں حصہ لے سکتا ہے اور دوسروں سے بڑھ کر حصہ لے سکتا ہے، مگر اس کو طاقتور اور منظم بنانے کے ذرائع یہ نہیں ہیں، بلکہ کچھ اور ہیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ یہ دیکھیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نئی قوم کن طریقوں سے بنائی تھی اور اس میں کن ذرائع سے وحدت اور قوتِ عمل پیدا کی تھی۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت لے کر اٹھے تھے تو ساری دنیا میں تنہا آپ ہی ایک مسلم تھے۔ کوئی آپ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا۔ دنیوی طاقتوں میں سے کوئی طاقت آپ کو حاصل نہ تھی گردوپیش جو لوگ تھے ان میں خودسری اور انفرادیت انتہا درجہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی کسی کی بات سننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ نسل اور قبیلہ کی عصبیت کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ ان کے ذہن ان خیالات اور مقاصد سے کوئی دور کا لگاؤ بھی نہ رکھتے تھے جن کی تبلیغ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے تھے۔ اس ماحول اور ان حالات میں کونسی طاقت تھی جس سے ایک تنہا انسان، بے یار و مددگار اور بے وسیلہ انسان نے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا؟ کیا آنحضرتؐ نے عربوں کو یہ لالچ دیا تھا کہ میں تم کو زمین کی حکومت دلواؤنگا؟ رزق کے خزانے دلواؤں گا؟ دشمنوں پر فتح اور غلبہ بخشونگا؟ بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کروں گا اور عرب کو ایک طاقتور سلطنت بنادونگا؟ تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی دوں گا، تمہارے وسائل معیشت بڑھاؤنگا اور تمہیں ایک ترقی یافتہ اور غالب قوم بناکر چھوڑونگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی لالچ آپ نے نہیں دلایا تھا۔ پھر کیا آپ نے امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کی اور سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مقابلہ میں مزدوروں اور کاشتکاروں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا تھا؟ سیرت نبوی گواہ ہے کہ یہ چیز بھی نہ تھی۔ پھر کیا آپ نے کوئی سیاسی، یا تعلیمی یا تمدنی یا معاشی یا فوجی تحریک اٹھائی تھی اور اس کی طرف لوگوں کو کھینچنے کے لیے نفسیاتی حربوں سے کام لیا تھا؟ واقعات شاہد ہیں کہ ان میں سے بھی کوئی چیز نہ تھی۔ پھر غور کیجیے کہ آخر وہ کس چیز کی کشش تھی جس نے عربی اور عجمی، امیر اور غریب، آقا اور غلام سب کو آپ کی طرف کھینچا؟ دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف دو چیزیں تھیں۔ ایک قرآن کی تعلیم۔ دوسرے محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ لوگوں کے سامنے یہ پیغام پیش کیا گیا تھا کہ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ ان کو اس بات پر جمع کیا گیا تھا کہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ ان کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ ان کے سامنے یہ نصب العین رکھا گیا تھا کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ پھر جس شخص نے ان کو یہ دعوت دی تھی اس کا حال یہ تھا کہ کان خلقہ القرآن۔ وہ جو کچھ کہتا تھا سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر خود اس پر عمل کر کے دکھاتا تھا۔ وہ فضیلت اخلاق اور عمل صالح کا مجسمہ تھا، اور اس کی زندگی میں راست بازی و راست روی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

یہی دو چیزیں تھیں جنہوں نے ہر طرف سے لوگوں کو کھینچا اور وہ قوم بنا دی جس کا نام مسلمان ہے۔ نوع انسانی کے مختلف طبقوں اور گروہوں میں سے جن جن لوگوں کے لیے ان دو چیزوں میں کوئی کشش تھی، وہ اس مرکز کی طرف کھنچتے چلے گئے اور انہی سے مسلمان قوم وجود میں آئی دوسرے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں سمجھیے کہ اسلامی جمعیت نام ہی اس جمعیت کا ہے جو قرآن اور سیرت محمدی کی کشش سے وجود میں آئی ہے۔ جہاں زندگی کے وہ اصول اور مقاصد ہوں گے جو قرآن نے پیش کیے ہیں، اور جہاں طرز عمل وہ ہوگا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، وہاں "مسلمان" جمع ہو جائیں گے، اور جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں گی وہاں ان لوگوں کے لیے قطعاً کوئی کشش نہ ہوگی جو "مسلمان" ہیں۔ اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہماری قومی تحریکات میں بنیادی نقص کونسا ہے جس کی وجہ سے مسلمان کسی تحریک کی طرف بھی فوج در فوج نہیں کھنچتے اور ہر داعی کی آواز بہرے کانوں سے سنتے ہیں۔ ان کی فطرت وہ آواز سننا چاہتی ہے اور وہ طرز عمل دیکھنا چاہتی ہے جس کی کشش نے ان کو ساری دنیا سے الگ ایک قوم بنایا تھا۔ مگر افسوس کہ نہ وہ آواز کسی طرف سے آتی ہے اور نہ وہ طرز عمل کہیں نظر آتا ہے۔ بلانے والے ان کو ایسے مقاصد کی طرف

بلاتے ہیں جو ان کی زندگی کے اصلی مقاصد نہیں ہیں۔ اور رہنمائی کے لیے اٹھتے ہیں تو وہ جن کی سیرت میں محمد رسول اللہ کی سیرت کی ادنیٰ جھلک تک نظر نہیں آتی جمہور مسلمین بڑی بڑی امیدیں لے کر ہر نئی تحریک کی طرف دوڑتے ہیں مگر مقاصد کی پستیاں اور عمل کی خرابیاں دیکھ کر ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

خیر یہ ایک دوسری داستان ہے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق تنظیم پر غور کیجیے کہ مسلمان قوم کی تنظیم اگر ہو سکتی ہے تو اسی طریق پر ہو سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی جمعیت اس ڈھنگ پر بنائی تھی کہ پہلے تو آپ نے انسانی گروہ میں صرف ان لوگوں کو چھانٹ لیا جن کی فطرت میں ایک خالص صداقت، اور ایک پاک زندگی کی طرف کھنچنے کی صلاحیت تھی۔ پھر تعلیم و تربیت کے بہترین ذرائع سے کام لے کر ان میں سے ایک ایک فرد کی اصلاح فرمائی، اس کے دل میں زندگی کا ایک بلند مقصد بٹھا دیا۔ اور اس کے کیرکٹر میں آہنی مضبوطی پیدا کی کہ وہ اُس مقصد کے لیے جم کر جدوجہد کرے اور کسی فائدہ کا لالچ یا کسی نقصان کا خوف اُسے اُس مقصد کی راہ سے نہ ہٹا سکے۔ اس کے بعد ان افراد کو ملا کر ایک جماعت بنا دیا تاکہ افراد میں جو کچھ کمزوریاں باقی رہ جائیں، جماعت کی طاقت ان کو دور کرے، اجتماعی ماحول ایسا بن جائے جس میں نیکیاں پرورش پائیں، افراد اپنے مقصد حیات کی تکمیل میں ایک دوسرے کے مددگار ہوں، اور اجتماعی طاقت سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس تعمیر کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ماہر فن انجینئر اینٹوں کے ڈھیر میں سے چھانٹ کر بہترین اینٹیں لے، پھر ان کو اس طرح پکائے کہ ایک ایک اینٹ بجائے خود پختہ ہو جائے۔ پھر ان سب کو نہایت عمدہ سیمنٹ سے جوڑ کر ایک مستحکم عمارت بنا دے۔

اس تنظیم کے بڑے بڑے اصول یہ تھے:۔

جماعت کے تمام افراد کم از کم دین کے جوہر سے واقف ہوں تاکہ وہ کفر و اسلام میں تمیز کر کے اسلام کے طریقہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔

اجتماعی عبادات کے ذریعہ سے افراد میں اخوت، مساوات اور تعاون کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔

جماعت کے تمدن و معاشرت میں ایسے امتیازی خصائص اور حدود مقرر کیے جائیں جن سے وہ دوسری قوموں میں خلط ملط نہ ہو سکیں اور باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے ایک الگ قوم بنے رہیں اسی لیے تشبہ بالاجانب کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی۔

تمام اجتماعی ماحول پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر چھایا رہے تاکہ جماعت کے دائرہ میں کوئی انحراف اور کوئی بغاوت راہ نہ پا سکے
پوری مسلمان قوم ایک انجمن ہو اور ہر مسلمان مرد اور عورت کو مجرد اسلامی حق کی بنا پر اس کی رکنیت کا مساویانہ مرتبہ حاصل
ہو ایسے تمام انتسابات اور امتیازات کو مٹا دیا جائے جو مسلم اور مسلم میں تفریق کرتے ہوں۔

جماعت کے تمام افراد ایک نصب العین پر متحد ہوں اور اس کے لیے جدو جہد اور قربانی کرنے کا جذبہ ان میں موجود ہو ایک گروہ
صرف اسی نصب العین کی خدمت کے لیے وقف رہے اور بقیہ افراد جماعت اپنی معاش کے لیے جدو جہد کرنے کے ساتھ ساتھ پہلے
گروہ کی ہر ممکن طریقہ سے مدد کرتے رہیں غرض ہر فرد جماعت کے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہو کہ اس کی زندگی محض اس کی اپنی ذات
کے لیے نہیں ہے بلکہ اس ایک قومی نصب العین کے لیے ہے۔

تنظیم کے یہی اصول تھے جن سے وہ زبردست جماعت پیدا ہوئی جو دیکھتے دیکھتے آدھی دنیا پر چھا گئی اس طرز تنظیم کی رفتار
ابتدا میں بہت سست تھی حتی کہ پندرہ برس تک وہ چند سو کے لگ بھگ سے زیادہ افراد کو اپنے دائرہ میں نہ لا سکی۔ مگر اس میں یہ قاعدہ ملحوظ
رکھا گیا تھا کہ توسیع کے ساتھ ساتھ استحکام بھی ہوتا رہے اس لیے یہ نظام جماعت جتنا پھیلتا
گیا اتنا ہی مضبوط ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب ایک معتدبہ جماعت اس طریق پر منظم ہو گئی تو وہ اتنی طاقت کے ساتھ اٹھی کہ دنیا کی کوئی
چیز اس کے سیل رواں کو نہ روک سکی قرآن مجید میں اس کی چھوٹی سی ابتدا پھر تدریجی ترقی پھر غیر معمولی شان و شوکت کے ساتھ اس کے ظہور کو
کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے: كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ

مسلمان قوم کے مزاج کے ساتھ یہی طریق تنظیم مناسبت رکھتا ہے۔ یہ قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ
نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا، اور مسلمانوں کو
مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے
یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے، لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لے لیے ہیں مگر ان کو معلوم نہیں ہے کہ جو چیزیں
دوسری قوموں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمان قوم کے مزاج کو موافق نہیں آتیں اس قوم کو اگر کوئی چیز راس آسکتی ہے تو وہ ایک ایسی جمہوری تحریک ہی
ہے جو پوری قوم کو ایک انجمن سمجھ کر شروع کی جائے اور جس میں توسیع سے پہلے استحکام کے اسی تناسب کو ملحوظ رکھا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملحوظ رکھا تھا اگر
آپ کمزور بنیادوں کو لیکر ریت کی سطح پر ایک بڑی عمارت کھڑی کر دیں گے اور اس سے قلعے کا کام لینا چاہیں گے تو لامحالہ وہ سیل حوادث کی
ایک ٹکر بھی نہ جھیل سکے گی۔

مقالات

حدیث نبوی سے شرائع کا استنباط

از افادات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ

(ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ)

علوم نبوی کی اقسام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی ہے اور کتب حدیث میں جمع کیا گیا ہے۔ اُس کی دو قسمیں ہیں۔

ایک وہ جو تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں ہے۔ اسی کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ مَا آتَاكُمُ الرسول فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (رسول تم کو جو کچھ دے اسے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ) اس سلسلہ میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں۔ مثلاً آپ نے علوم معاد اور عجائب ملکوت جو کچھ بیان کئے وہ سر تا سر وحی کی سند پر ہیں اور اجتہاد کا ان میں کوئی دخل نہیں۔ شرعی احکام اور عبادات کے ضوابط اور تمدنی معاملات کے متعلق جو ہدایات آپ نے دیں ان میں سے بعض وحی پر مبنی ہیں اور بعض اجتہاد پر۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی بمنزلۂ وحی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو اس بات سے محفوظ کر دیا تھا کہ آپ کسی غلط رائے پر جم جائیں۔ پھر یہ گمان کرنا بھی صحیح نہیں کہ آپکا اجتہاد منصوص احکام سے استنباط کے طور پر تھا بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم و ہدایت سے مقاصد شرع اور قانون تشریع اور اصول تیسیر احکام پر حاوی ہو چکے تھے اس لیے آپ جو کچھ بھی اجتہاد فرماتے وہ اسی الٰہی ہدایت پر مبنی ہوتا تھا۔ اسی سلسلہ میں حکمت اور مصلحت کی وہ باتیں بھی داخل ہیں جو حضور نے بسبیل عموم و اطلاق بیان کی ہیں، اور جن کے لیے آپ نے حدود اور قواعد مقرر نہیں فرمائے ہیں مثلاً اخلاق صالحہ اور خصائل مذمومہ اور فضائل اعمال اور مناقب عمال وغیرہ۔ ان

بعض وحی پر مبنی ہیں اور بعض اجتہاد پر مگر ان معاملات میں بھی آپکا اجتہاد اس معنی میں نہیں ہے کہ آپ نے دنیوی حکماء کی طرح غور وخوض کرکے کسی چیز کو اچھا اور کسی کو برا ٹھیرایا ہو، اور اس میں غلطی کا امکان ہو۔ بلکہ وہ اس معنی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب میں مصالح عباد اور قوانین ارتفاق کا علم بھر دیا تھا اور یہی علم اس حکمت ~~خدا~~ انانی کا منبع تھا جس سے آپ کلیات اخذ کرتے تھے اور ان سے جزئیات نکالتے تھے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق تبلیغ رسالت کے سلسلہ سے نہیں ہے۔ اسی کے متعلق حضور نے فرمایا کہ۔ انما انا بشر اذا امرتکم بشیء من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیء من رأی فانما انا بشر (میں ایک انسان ہوں۔ جب میں تم کو دین کی کسی بات کا حکم دوں تو اس کی پیروی کرو۔ اور جب اپنی رائے سے کوئی بات کہوں تو میری حیثیت ایک انسان ہی کی ہے) اور اس کی طرف حضور کا وہ ارشاد بھی اشارہ کرتا ہے جو آپ نے درخت خرما کو گابھہ لگانے کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ فانی ظننت ظنا ولا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئا فخذوا بہ فانی لم اکذب علی اللہ۔ (میں نے تو ایک بات اپنے گمان سے کہی تھی اور تم میرے گمان پر گرفت نہ کرو۔ البتہ جب میں کوئی بات خدا کی طرف سے کہوں تو اس کی پیروی کرو کیونکہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا)۔ اس دوسری قسم کے علوم میں بہت سی چیزیں ہیں، مثلاً حدیث کے وہ ابواب جو طب سے تعلق رکھتے ہیں، اور آپ کا وہ ارشاد کہ تم فلاں قسم کے گھوڑے استعمال کرو۔ ان چیزوں کی بنا تجربہ پر تھی نہ کہ وحی یا اجتہاد نبوی پر۔ اسی طرح آپ کے وہ افعال جو آپ نے عادت کے طور پر کئے ہیں نہ کہ عبادت کے طور پر یا اتفاقاً کیے ہیں نہ کہ قصداً۔ یا وہ باتیں جو آپ نے اسی طریقہ سے بیان کی ہیں جس طریقہ پر آپ کی قوم کے لوگ بیان کیا کرتے تھے۔ مثلاً ام ذرع کا قصہ اور خرافہ کا قصہ کہ ان چیزوں کا بھی کوئی تعلق تبلیغ رسالت سے نہیں ہے۔

حضرت زید بن ثابت کے پاس ایک مرتبہ چند لوگ حاضر ہوئے اور انہوں نے فرمائش کی کہ ہمیں رسول اللہ

کی باتیں سنائیے جواب میں حضرت زید نے فرمایا کہ "میں حضور کا پڑوسی تھا۔ جب آپ پر کوئی وحی نازل ہوتی تو آپ مجھے بلا بھیجتے اور میں اس وحی کو لکھ دیتا تھا۔ پھر آپ کی صحبت میں بیٹھ کر جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس ذکر میں شریک ہو جاتے تھے، اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ اس میں بھی ہمارے ساتھ حصہ لیتے تھے؛ اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تو آپ اس میں بھی ہمارا ساتھ دیتے تھے۔ اب کیا میں یہ سب باتیں احادیث رسول کی حیثیت سے تمہارے سامنے بیان کر دوں ؟" اس قول میں حضرت زید کی مراد حضور کی ایسی ہی باتوں سے تھی جو آپ بحیثیت ایک انسان کے اپنے گھر میں یا اپنے دوستوں کی صحبت میں کیا کرتے تھے اور جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے نہ تھا۔

اسی سلسلہ میں وہ کام بھی آ جاتے ہیں جو حضور نے اپنے عہد کی کسی جزئی مصلحت کی خاطر کیے تھے اور جو تمام امت کے لیے امور لازمہ میں سے نہیں ہیں۔ اس قسم کے کاموں کی حیثیت ایسی ہے جیسے خلیفۂ وقت اپنے زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے فوجوں کی صف آرائی کے لیے کوئی خاص طریقہ مقرر کرے یا اپنی افواج کے لیے کوئی خاص شعار معین کرے کہ یہ چیزیں بعد والوں کے لئے لازم نہیں ہوتیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی بنا پر فرمایا تھا کہ "اب ہم کو طواف میں اکڑ کر چلنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ہم ایک خاص قوم پر اپنی قوت کے اظہار کے لیے کرتے تھے، اور وہ قوم اب ہلاک ہو چکی ہے"۔ مگر بعد میں آپ نے محض اس خوف سے یہ رائے واپس لے لی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ اور مقصد بھی ہو اور وہ ہماری سمجھ میں نہ آیا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے احکام اسی قبیل سے شمار کیے گئے ہیں۔ مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ جو شخص کسی کو جہاد میں قتل کرے اس کے کپڑے اور ہتھیار وغیرہ اسی کو دیئے جائیں۔ یا مثلاً آپ کے خاص فیصلے جو آپ نے خاص معاملات میں فرمائے تھے کہ مقدمات میں انہی کی پیروی لازم نہیں ہے بلکہ ہر مقدمہ کا فیصلہ ثبوت اور شہادت کی بنا پر کرنا ضروری ہے۔ اسی کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس قول میں اشارہ

کیا ہے جو آپ نے حضرت علی سے فرمایا تھا کہ "غائب ان سب چیزوں کو نہیں دیکھ سکتا جو حاضر کے پیش نظر ہوتی ہیں"

مصالح اور شرائع کا فرق | شارع نے ہم کو دو قسم کے علم دئے ہیں جن کے احکام باہم مختلف اور جن کے مواقع باہم متباین ہیں۔

ایک قسم کا علم وہ ہے جو مصالح اور مفاسد سے تعلق رکھتا ہے، یعنی وہ علم جس میں شارع نے ہم کو اخلاقِ فاضلہ کے اکتساب اور خصائلِ ردیہ کے ازالہ سے تہذیبِ نفس کے طریقے بتائے ہیں اور تدبیرِ منزل اور آدابِ معاش اور سیاستِ مدینہ کے متعلق ہدایات دی ہیں۔ اس علم میں تمام تر کلیات اور اصول ہیں۔ کسی چیز کی مقدار معین نہیں کی گئی، نہ کوئی ایسا ضابطہ بنایا گیا ہے جو ہر ایک چیز کی حد معین کرتا ہو، نہ ایسی تفصیلات دی گئی ہیں جن میں ہر جزئیہ دوسرے جزئیہ سے ممیز ہو۔ بلکہ عمومیت کے ساتھ فضائل کی طرف رغبت اور رذائل سے نفرت دلائی گئی ہے، اور کلام اس طرز پر کیا گیا ہے کہ ہر شخص جو زبان سے واقف ہے اس کا مفہوم خود سمجھ سکتا ہے، اور ہر شخص جو نفس مصلحت یا نفس مفسدہ کو جانتا ہے وہ خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس موقع پر کیا کس حد تک مطلوب ہے یا قابلِ حذر ہے۔ مثال کے طور پر کیاست اور شجاعت کی مدح کی گئی اور رفق و محبت کا حکم دیا گیا اور معیشت میں اقتصاد کی ہدایت کی گئی مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ ان چیزوں کی حد کیا ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، اور ان کی عملی صورتیں کون کونسی ہیں جنہیں اختیار کیا جائے، اور ان میں کوتاہیاں کونسی ہیں جن سے پرہیز کیا جائے۔

دراصل شارع کے پیش نظر تین مقاصد ہیں جن کی طرف تمام احکام اور ہدایات کا مرجع ہے:۔

۱۔ تہذیبِ نفس، اُن اخلاق و خصائل کے ذریعہ سے جو دنیا اور آخرت میں نافع ہیں۔

۲۔ اعلاءِ کلمۂ حق اور تمکینِ شرائع اور اشاعتِ دینِ حق۔

۳۔ بندگانِ خدا کے معاملات کا انتظام اور ان کے طرزِ عمل کی شائستگی اور ان کو ایک دوسرے کی بھلائی میں مددگار بنانا۔

ہر بھلائی جس پر شارع نے ہم کو ابھارا ہے اور ہر برائی جس سے اس نے ہمیں روکا ہے، اسی حیثیت سے بھلی یا بری ہے کہ وہ ان مقاصد اصلیہ میں سے کسی ایک یا سب کے موافق یا مخالف ہو۔ جو چیز ان کی طرف لے جانے والی ہو وہ بھلی ہے اور شارع چاہتا ہے کہ اس کو اختیار کیا جائے اور جو چیز ان کے حصول میں مانع ہو، یا جس سے اندیشہ ہو کہ وہ مانع ہو سکتی ہے، یا جو اپنی فطرت کے اختیار سے ایسی ہو کہ ان مقاصد سے انسان کو پھیر دینا ہی اس کا خاصہ ہو، یا جس کا تعلق عادۃً ان مقاصد کے اضداد ہی سے رہا ہو، وہ شارع کی نگاہ میں بری ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ انسان اس سے بچے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کا تعلق ان مصالح سے اور اس کی ناراضی کا تعلق ان مفاسد سے دائمی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے پہلے اور بعد یکساں رہا ہے۔ اگر یہ دائمی تعلق نہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام بھیجے ہی نہ جاتے۔ شرائع اور حدود فی نفسہ مقصود نہیں ہیں کہ محض ان کے لیے انسان کو مکلف کرنے اور ان پر انسان سے مواخذہ کرنے کی خاطر انبیاء کو مبعوث کیا جاتا۔ دراصل یہ مصالح اور مفاسد چونکہ نفس انسانی کی تہذیب یا تلویث کے موجب تھے، اور نوع انسانی کی فلاح یا خسران سے ان کا گہرا تعلق تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اس کا مقتضی ہوا کہ ایسے برگزیدہ نفوس بھیجے جو بنی آدم کو ان چیزوں سے خبردار کریں جو ان کے لیے اہمیت رکھتی ہیں، اور ان چیزوں پر مکلف کریں جو ان کے لیے ناگزیر ہیں۔ اور چونکہ یہ مقصد بغیر اس کے حاصل نہیں ہو سکتا تھا کہ لوگوں کے لیے حدود اور شرائع مقرر کیے جائیں اس لیے اللہ کا لطف و کرم پھر اس کا مقتضی ہوا کہ انہی برگزیدہ نفوس کے ذریعہ سے شرائع اور حدود مقرر کرے۔

مصالح اور مفاسد کا یہ علم جو حدود اور شرائع کی جڑ ہے اس میں تمام تر وہ چیزیں ہیں جو معقول المعنی ہیں اور جن کا تعلق بالکلیہ فہم اور تدبر سے ہے۔ ان میں بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کو عام طور پر لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کے فہم کا دروازہ صرف انہی لوگوں پر کھلتا ہے جن کے قلوب پر انبیاء علیہم السلام کے نورِ علم کا فیضان ہوا ہو اور جنہوں نے اصولِ شرع کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیا ہو۔

دوسری قسم کا علم شرائع اور حدود اور فرائض کا علم ہے جس میں مقادیر کی توضیح کی گئی ہے شارع

اس علم میں صاف اور واضح طور پر ہم کو بتاتا ہے کہ بھلائی کے کام کونسے ہیں، کن چیزوں میں بھلائی کی توقع کی جاتی ہے، کونسی علامتیں ہیں جن سے بھلائی پہچانی جاتی ہے۔ انہی چیزوں پر وہ احکام کو دائر کرتا ہے اور لوگوں کو ان کا مکلف ٹھیراتا ہے۔ وہ ارکان اور شروط اور آداب کی تعیین سے خیر و صلاح کی ایک ایک نوع کو منضبط کرتا ہے، اور ہر نوع کے لیے ایک حد مقرر کر دیتا ہے کہ اس کو پورا کرنا تو لامحالہ ضروری ہے اور اس سے زائد عمل کرنا ضروری نہیں مگر پسندیدہ ہے۔ اس طرح تکلیف شرعی کا رخ فی نفسہٖ ان چیزوں کی طرف پھر جاتا ہے جن میں بھلائی کی توقع ہے، اور احکام کا مدار بالذات وہ چیزیں قرار پاتی ہیں جو بھلائی کی علامات ہیں۔

اس نوع کے علم کا مرجع قوانین سیاست ملیہ ہیں اور اس میں مصلحت یا مفسدہ کی توقع پر جتنی چیزوں کو واجب یا ممنوع قرار دیا گیا ہے وہ سب کی سب ایک ضابطہ سے منضبط ہیں، امور محسوسہ میں سے ہیں اور ایسے کھلے اوصاف سے متصف ہیں جن کو خاص و عام سب جان سکتے ہیں۔

ایجاب اور تحریم کے احکام جن اصول اور قوانین پر مبنی ہیں ان کو تو ہم جان سکتے ہیں، اور ان اسباب میں سے بھی بہتوں کو ہم جانتے ہیں جن کی بنا پر کسی چیز کو واجب اور کسی چیز کو حرام کیا گیا ہے، مگر یہ بات کہ کونسی چیز کس مقدار یا کس تعداد یا کس شکل میں واجب ہے، اور کونسی چیز کس طور پر حرام ہے اس کا تعین عقلی نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر منحصر ہے جو ملاء اعلیٰ میں لکھا ہوا ہے اور ہمارے پاس اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ بجز نص شارع کے نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم اس قاعدۂ طبیعی کو تو جانتے ہیں کہ برف بننے کا سبب پانی کو ٹھنڈک پہنچنا ہے۔ مگر یہ بات کہ اس وقت جو پانی سے بھرا ہوا پیالہ ہمارے سامنے رکھا ہے اس کا پانی برف بن گیا ہے یا نہیں، اس کا علم ہم کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ یا تو ہم خود اس کا مشاہدہ نہ کریں یا کسی مشاہدہ کرنے والے سے ہم کو اس کی خبر نہ ملے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہم یہ تو جانتے ہیں کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے بہرحال ایک نصاب ہونا چاہیئے،

اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دو سو درہم اور پانچ وسق کی مقداریں نصاب کے لیے بالکل مناسب ہیں کیونکہ ان کا مالک آسانی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے، لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ یہی وہ نصاب ہے جو اللہ نے ہمارے لیے مقرر کیا ہے اور اسی پر اللہ کی خوشنودی و ناخوشی کا مدار ہے۔ یہ بات ہم کو صرف نص شارع ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔

علماء کی ایک معتدبہ جماعت اس بات پر متفق ہے کہ مقادیر کے باب میں قیاس جاری نہیں ہوسکتا۔ ان کے نزدیک قیاس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کسی مشترک علت کی بنا پر اصل کا حکم فرع میں بھی جاری کر دیا جائے۔ مگر یہ جائز نہیں کہ ہم بطور خود کسی مصلحت کے مظنہ کو علت قرار دے لیں یا کسی چیز کو مناسب دیکھ کر رکن یا شرط ٹھیرا دیں۔ نیز اس پر بھی وہ متفق ہیں کہ محض مصلحت کا موجود ہونا قیاس کے لیے کافی نہیں بلکہ کوئی منضبط علت ہونی چاہیے جس پر حکم دائر کیا جا چکا ہو۔ مثال کے طور پر کسی ایسے مقیم شخص کو جو کسی حرج میں مبتلا ہو مسافر پر قیاس کرکے نماز اور روزے کی رخصتوں کا مجاز نہیں ٹھیرایا جا سکتا، کیونکہ مسافر کو قصر و افطار کی جو اجازت دی گئی ہے اس کی مصلحت اگرچہ دفع حرج ہی ہے، لیکن یہ امر کی علت نہیں ہے بلکہ شارع نے سفر کو اس کی علت قرار دیا ہے۔

ان مسائل میں علماء کے درمیان اجمالاً تو اختلاف نہیں ہے، مگر تفصیل میں اختلاف ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اکثر ایسے معاملات پیش آتے ہیں جن میں علت پر مصلحت کا شبہ ہوتا ہے۔ ہمار، کا تو یہ حال ہوا کہ جب قیاس کی گہرائیوں میں گئے تو ان پر حیرت طاری ہو گئی، چنانچہ بعض مقادیر کو انہوں نے بجنسہٖ باقی رکھنے پر اصرار کیا اور ان سے ملتی جلتی دوسری مقادیر اختیار کرنے سے انکار کر دیا، اور بعض مقادیر کو دوسری مقادیر سے بدلنے میں ان سے تسامح ہو گیا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انہوں نے کپاس کے لیے پانچ گٹھ[1] کا نصاب مقرر کیا اور کشتی کے سفر کو دورانِ سر کا مظنہ ٹھیرا کر اجازت دے دی کہ اس میں بیٹھ کر نماز ادا کی جائے اور بار کثیر کے لیے دس ہاتھ سے دس ہاتھ کی مقدار مقرر کی۔

جب کسی معاملہ میں شریعت ہم کو اپنے حکم کی مصلحت سمجھا دے، اور ہم وہی مصلحت کسی دوسرے معاملہ میں موجود پائیں تو بلاشبہ ہم وہی حکم اس دوسرے معاملہ میں بھی جاری کرسکتے ہیں، کیونکہ ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا تعلق دراصل اس مصلحت سے ہے، نہ کہ اس خاص معاملہ سے۔ لیکن مقادیر کا مسئلہ اس سے مختلف ہے، کیونکہ یہاں رضا کا تعلق خاص انہی مقادیر سے ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی وقت کی نماز چھوڑ دے تو وہ بہرحال گناہ گار ہوگا چاہے وہ اس وقت ذکر الٰہی یا کسی دوسری قسم کی عبادت ہی میں کیوں نہ مشغول رہا ہو۔ اسی طرح جو شخص زکوٰۃ مفروضہ ادا نہ کرے، وہ اگر اس سے بہت زیادہ مال کسی کار خیر میں صرف کردے تب بھی گناہ سے نہ بچ سکے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص خلوت میں ریشمی لباس اور سونا پہنے جہاں نہ فقراء کی دل شکنی کا اندیشہ ہے، نہ اس بات کا خوف ہے کہ اس سے لوگوں میں دنیا طلبی کی پیاس بڑھ جائے گی، نہ اس امر کا کوئی امکان ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں اس کی شان اور ترفع کا اظہار ہو، تب بھی وہ گناہ گار ہی ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دوا کے طور پر شراب پیے اور اس میں کسی فساد یا ترک صلوٰۃ کا خوف نہ ہو تب بھی گناہ بہرحال اس پر عائد ہوگا؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور ناخوشی نفس ان اشیاء ہی سے وابستہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غرض اصلی مفاسد کا سدباب اور مصالح کا حصول ہے، لیکن حق تعالیٰ جانتا تھا کہ سیاستِ امت بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ نفس ان اشیاء ہی کو واجب یا حرام کیا جائے اس لیے اس کی خوشنودی اور ناخوشی انہی کے ساتھ بالذات متعلق ہوئی۔ بخلاف اس کے اگر کوئی شخص ریشم سے بہت زیادہ قیمتی اون کا لباس پہنے یا سونے سے بہت زیادہ قیمتی جواہر کے برتن استعمال کرے، تو وہ فی نفسہٖ اس فعل سے گناہ گار نہ ہوگا، اس لیے کہ اس نے حکم صریح کی خلاف ورزی اور نافرمانی نہیں کی۔ البتہ اگر اس کے فعل میں غریبوں کی دل شکنی، یا اسراف کی تحریص یا تفاخر کا قصد متحقق ہوجائے تو وہ ان مفاسد کی وجہ سے رحمت الٰہی سے دور ہوجائے گا۔

صحابۂ کرام اور تابعین رحمہم اللہ کو جہاں کہیں تم ایسا فعل کرتے دیکھو جو مقادیر کی تعیین سے مشابہ

نظر آتا ہو، وہاں سمجھ لو کہ ان کا مقصد دراصل مقادیر کی تعیین نہیں ہے، بلکہ مصلحت کا بیان اور اس کی طرف ترغیب اور مفسدہ کا بیان اور اس سے ترہیب ہے، اور انہوں نے جو خاص صورت کسی حکم کی تجویز کی ہے وہ بطور مثل کے ہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہی صورت مقصود نہیں ہے بلکہ دراصل معانی مقصود ہیں، اگرچہ بادی النظر میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ صورت کی تعیین مقصود ہے۔ اور جس جگہ خود شرع نے کسی مقدار کو قیمت سے بدل دینا جائز رکھا ہے، جیسے ایک قول کے مطابق زکوٰۃ میں بنت مخاض[1] کے بجائے اس کی قیمت دینے کی اجازت ہے، تو اس کو تسلیم کرتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کی تعیین مقدار ہی ہے، کیونکہ تعیین مقدار میں ایسا استقصار نہیں کیا جا سکتا جو دائرۂ عمل کو تنگ کر دینے کا موجب ہو۔ لہٰذا بسا اوقات اس طور پر مقدار معین کی جاتی ہے کہ اس کا اطلاق بہت سی چیزوں پر ہو سکتا ہو جیسے یہی بنت مخاض کہ کبھی ایک بنت مخاض دوسرے بنت مخاض سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات قیمت سے مقدار کی تعیین کرنے میں فی الجملہ ایک حد معلوم ہوتی ہے، جیسے چوری میں قطع ید کا نصاب ایسی چیز کو قرار دیا گیا جس کی قیمت چوتھائی دینار یا تین درہم ہو۔

یہ بھی سمجھ لو کہ ایجاب اور تحریم دونوں تقدیر[2] کی قسم سے ہیں، یہ اس لیے کہ بہت سی چیزیں جو مصلحت یا مفسدہ نظر آتی ہیں ان کی صورتیں بے شمار ہیں اور ہو سکتی ہیں، لہٰذا شارع نے چند خاص صورتیں ایجاب کے لیے اور چند خاص صورتیں تحریم کے لیے معین کر دیں، کیونکہ وہ ایسی صورتیں تھیں جو ضبط میں آ سکتی تھیں یا لوگوں کو ملل سابقہ میں اُن کا حال معلوم تھا، یا ان کی طرف انسانی طبائع زیادہ راغب تھیں۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کے معاملہ میں عذر فرمایا کہ مجھے خوف ہے کہیں وہ تم پر فرض نہ کر دی جائے اور مسواک کے متعلق فرمایا کہ اگر میری امت پر سختی کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کو مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

[1] اونٹ کا وہ بچہ جو ایک سال سے گذر کر دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔

[2] تقدیر سے مراد تعیین مقادیر ہے۔

پس جب حال یہ ہے تو یہ کسی طرح جائز نہیں کہ جن چیزوں کا حکم منصوص نہیں ہے ان کو منصوص پر قیاس کر کے فرض یا حرام قرار دیا جائے۔ رہا ندب[1] اور کراہت تو اس میں تفصیل ہے۔ ہر وہ مندوب فعل جس کو شارع نے کرنے کا حکم دیا، اور جس کے حکم کی تصریح کی اور جس کی عہد صحابہ و تابعین کے لوگوں نے پابندی کی اس کا حال وہی ہے جو واجب کا حال ہے۔ اور جس مندوب فعل کی محض مصلحت بیان کرنے پر شارع نے اکتفا کیا، یا جس پر خود شارع نے عمل کیا مگر اس کو دوسروں کے لیے سنت نہیں بنایا، نہ اس کی پابندی پر زور دیا تو وہ اسی حالت پر باقی ہے جس پر تشریع سے پہلے تھا۔ اس میں جو کچھ بھی اجر ہے وہ اس مصلحت کے لحاظ سے ہے جو اس کے ساتھ وابستہ ہو، نہ کہ نفس فعل کے اعتبار سے۔ یہی تفصیل مکروہات میں بھی ہے۔ اس مقدمہ کو جب تم اچھی طرح سمجھ لوگے تو تم پر واضح ہو جائیگا کہ بہت سے قیاسی مسائل جن پر لوگ فخر کرتے ہیں، اور جن کی بنا پر وہ متبعین حدیث کو مطعون کرتے ہیں، وہ دراصل خود انہی کے لیے وبال ہیں، مگر وہ نہیں جانتے۔

نبی سے اخذ شرع کی کیفیت | نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے امت نے دو طرح پر شریعت اخذ کی ہے، ایک اخذ ظاہر، دوسرے اخذ بطور دلالت۔

اخذ ظاہر کی دو صورتیں ہیں۔ متواتر اور غیر متواتر۔

متواتر کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو لفظاً متواتر ہے، مثلاً قرآن عظیم اور چند احادیث جن میں سے ایک یہ حدیث ہے کہ انکم سترون ربکم کما ترون ھذا القمر لا تضامون فی رؤیتہٖ[2]

دوسری وہ جو معنیً متواتر ہے جیسے طہارت اور نماز اور زکوٰۃ اور روزے اور حج اور بیوع اور نکاح اور غزوات کے کثیر التعداد احکام جن میں مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہیں۔

---

[1] ندب سے مراد کسی کام کی طرف رغبت دلانا اور اس کے کرنے کی طرف دعوت دینا ہے۔ اور مندوب اس کام کو کہتے ہیں جس کی دعوت دی گئی ہو۔

[2] تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو کہ اسے دیکھنے کے لیے تمہیں ہجوم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ سے اس کو دیکھ رہا ہے۔

رہا غیر متواتر تو اس کے مختلف درجات ہیں۔ اعلیٰ درجہ خبر مستفیض کا ہے۔ یعنی وہ جس کو کم از کم تین صحابہ نے حضور سے نقل کیا ہو اور اس کے بعد پانچویں طبقہ تک رواۃ کی تعداد برابر بڑھتی چلی جائے۔ اس قسم کی احادیث بکثرت موجود ہیں اور فقہ کے بڑے بڑے مسائل انہی پر مبنی ہیں۔ اس کے بعد ایسی خبر کا درجہ ہے جس کی صحت یا حسن کا فیصلہ اکابر محدثین اور حفاظ حدیث نے بالاتفاق کر دیا ہو۔ پھر ان خبروں کا درجہ ہے جن میں کلام کیا گیا ہو۔ بعض نے قبول کیا ہو اور بعض نے رد کر دیا ہو۔ ان میں سے جس خبر کی تائید پر شواہد موجود ہوں یا جس کی تائید اکثر اہل علم نے کی ہو یا جس کی صحت پر عقل صریح شہادت دیتی ہو اس کا اتباع ضرور کرنا چاہئے۔

اخذ بطور دلالت یہ ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فعل کرتے دیکھا یا حضور سے کوئی بات سُنی۔ اس سے وجوب وغیرہ کا کوئی حکم مستنبط کیا، اور اس استنباط کی بنا پر لوگوں سے کہا فلاں بات واجب ہے اور فلاں جائز۔ پھر تابعین نے صحابہ سے اسی طرح اخذ کیا، اور ان کے بعد تیسرے طبقہ کے لوگوں نے ان کے فتاویٰ اور فیصلوں کو مدوّن کر دیا۔ اس باب میں جو صحابہ سب سے پیش پیش ہیں وہ حضرات عمر، علی، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ صحابہ سے مشورہ اور بحث کرتے اور کوئی فیصلہ اس وقت تک نہ کرتے تھے جب تک کہ حقیقت بالکل بے نقاب نہ ہو جاتی اور آپ کو صحت کا وثوق حاصل نہ ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اکثر فیصلوں اور فتووں کو تمام دنیائے اسلام میں قبول کیا گیا اور اسی بنا پر ابراہیم النخعی نے کہا ہے کہ جب حضرت عمر نے وفات پائی تو علم کے دس حصوں میں سے نو حصے چلے گئے، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عمر جب کسی طریقہ پر چلتے تو ہم اس کو آسان پاتے تھے۔ بخلاف اس کے حضرت علی رضی اللہ عنہ عموماً مشورہ نہ فرماتے تھے اس لیے آپ کے اکثر فیصلے کوفہ ہی تک محدود رہے اور بہت کم لوگوں نے ان کو لیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی کوفہ میں رہے اور اسی علاقہ کے لوگوں نے

زیادہ تر ان کے فیصلے اختیار کیے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابہ کا عہد گذر جانے کے بعد اجتہاد کیا اور بہت سے احکام میں ان سے اختلاف کیا۔ ان کے فتاوی کو زیادہ تر اہل مکہ نے لیا ہے جو ان کے شاگرد تھے۔ مگر جمہور اہل اسلام نے ان کے ایسے فتووں کو قبول نہیں کیا جن میں وہ منفرد تھے۔ ان چار بزرگوں کے سوا جو صحابہ تھے وہ دلالت پر تو نظر رکھتے تھے، مگر آداب اور سنن کو رکن اور شرط سے ممیز نہیں کرتے تھے۔ ان میں حضرات ابن عمر، عائشہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے صحابہ شامل ہیں۔

تابعین میں سے بھی چند لوگ اس باب میں نمایاں ہیں مثلاً مدینہ میں سعید بن المسیب، مکہ میں عطاء بن رباح، کوفہ میں ابراہیم النخعی، قاضی شریح اور شعبی، بصرہ میں حسن رضی اللہ عنہم۔

ان دونوں طریقوں میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ خلل رہتا ہے جس کو دور کرنے کے لیے دوسرے طریقے سے مدد لینی پڑتی ہے، اس لیے کوئی ایک طریقہ دوسرے طریقہ سے بے نیاز نہیں ہے۔ اخذ ظاہر میں اس طرح خلل واقع ہوتا ہے کہ مثلاً راوی اصل الفاظ بھول گیا اور جو معنی اس کے ذہن میں محفوظ رہے ان کو اس نے دوسرے الفاظ سے ادا کیا جن سے معنی میں کچھ نہ کچھ تغیر ہو گیا۔ یا مثلاً حکم ایک واقعہ خاص میں تھا، راوی نے سمجھا کہ حکم کلی ہے، یا مثلاً کوئی بات تاکید کے ڈھنگ پر کہی گئی تھی تاکہ لوگ اس کی اہمیت سمجھیں اور اس کا اہتمام کریں، راوی نے سمجھا کہ وجوب یا حرمت کا حکم ہے، حالانکہ معاملہ یہ نہ تھا۔ ایسی صورتوں میں صحیح مطلب وہی سمجھتا ہے جو فقیہ ہو اور اصل واقعہ کی تفصیلات اس کے سامنے ہوں اور قرائن سے حقیقت حال کو سمجھے۔ مثال کے طور پر حدیث میں مزارعت سے منع کیا گیا ہے اور پھلوں کا حسن و قبح ظاہر ہونے سے پہلے ان کی بیع کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت زید موقع و محل اور انداز کلام سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس سے مراد تحریم نہیں ہے بلکہ حضور کا یہ ارشاد مشورہ کے طور پر تھا۔ دوسری طرف اخذ بالدلالت میں بھی مختلف صورتوں سے خلل واقع

ہوتا ہے۔ اس میں صحابہ و تابعین کے قیاسات اور کتاب و سنت سے ان کے استنباط کا بڑا دخل ہے اور نیز یہ ہے کہ اجتہاد ہمیشہ صحیح تو نہیں ہوتا۔ پھر ایسا بھی ہوا ہے کہ ان کو کوئی حدیث نہیں پہنچی یا اس طور پر پہنچی کہ اس سے احتجاج نہیں کیا جا سکتا، اس لیے انہوں نے اس پر عمل نہ کیا، بعد میں کسی دوسرے صحابی کے ذریعہ سے صحیح بات معلوم ہوئی جیسے جنابت میں تیمم کا مسئلہ ہے کہ اس میں حضرت عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کو غلط فہمی پیش آئی بہت سے معاملات ایسے بھی ہیں جن میں صحابہ رضی عنہم نے محض دلالت عقلی کی بنا پر ایک رائے بالاتفاق قائم کر لی تھی حالانکہ شرع میں ان کی کوئی تصریح نہ تھی اسی کی طرف حضور نے اشارہ فرمایا کہ تم میری سنت کا التزام کرو اور میرے بعد میرے خلفاء راشدین کے طریقہ کی پیروی کرو۔

پس جو شخص اخبار و آثار اور الفاظ حدیث پر وسیع نظر رکھتا ہو وہ ایسی پر خطر راہوں سے بخیریت گذر سکتا ہے جہاں قیاس و اجتہاد کے قدم پھسل جایا کرتے ہیں۔ اسی بنا پر فقیہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں طریقوں میں درک حاصل کرے اور دونوں مذہبوں میں تبحر پیدا کرے۔ اور شعائر ملت میں بہترین شعار وہ ہے جس پر جمہور رواۃ اور اکثر حاملین علم کا اجماع ہو اور جس میں دونوں طریقوں کا تطابق پایا جاتا ہو۔

مقاصد قرآن

(۳)

از جناب مولانا سید صبغۃ اللہ حسینی استاذ جامعہ دار السلام عمرآباد

دین اسلام کا تیسرا رکن "عمل صالح"

انبیاءِ کرام کی بعثت کے مقاصد میں سے تیسرا مقصد نیک عملی کی زندگی ہے جس کو قرآن مجید میں بار بار ذکر کیا گیا ہے، اور متعدد سورتوں میں مختلف پیرایہ بیان میں پیش کیا گیا ہے تاکہ اس سلسلہ میں ان تمام امور کی پوری اصلاح کر دی جائے جن کو افراد نوع انسانی نے بگاڑ رکھا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ انسان کی شخصی اور اجتماعی فلاح و بہبود کے ساتھ عمل صالح کا کس قدر گہرا تعلق ہے اگر اس چیز کی یاد دہانی کے لیے تکرار و اعادہ کی ضرورت نہ ہوتی تو سورۂ عصر مختصر ہونے کے باوجود عملی اصلاح کے لیے بہت کافی تھی جیسے سورۂ اخلاص باری تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی توحید و تنزیہہ کے لیے بہت جامع ہے۔ یہ حقیقت میں قرآن عزیز کا اعجاز ہے کہ اس کے مقاصد و اغراض کبھی صرف ایک آیۃ یا چھوٹی سی سورۃ میں سمٹ جاتے ہیں اور کبھی اس قدر تفصیل و اطناب کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں کہ ایک ایک پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔

عمل صالح کی حقیقت | ایمان باللہ کے لوازم میں درجہ اول پر عمل صالح ہے کیونکہ جب یہ بات دل میں اتر جائیگی کہ اللہ ہی انسان کا اصلی مالک اور حاکم ہے اور اسی کی فرماں برداری فرض عین ہے، اور اسی کی رضا پر فلاح اور ناراضی پر خسران کا انحصار ہے تو غیر ممکن ہے کہ کوئی شخص اس کے بتائے ہوئے نیک کاموں سے روگردانی کر جائے اور اس کے منع کیے ہوئے امور سے باز نہ آئے۔ پھر اس کے بعد خود بخود اعمال کی جزا و سزا کا اس کو خیال

پیدا ہو جائیگا اور اللہ تعالیٰ کے عقاب سے خوف اور اس کے ثواب و فضل کی امید ہونے لگے گی۔

اعمال صالحہ کے مفہوم میں نہ صرف وہ تمام عبادتیں داخل ہیں جن کے ذریعہ بارگاہ الٰہی میں تقرب حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ تمام بھلائی کے کام بھی اسی دائرے میں آجاتے ہیں جن سے انسانوں کی انفرادی و اجتماعی اصلاح ہوتی ہے اور رفاہ عام کے کام انجام پاتے ہیں۔ مثلاً والدین کے ساتھ احسان، رشتہ داروں سے نیک سلوک اور صلہ رحمی، ہمسایوں کے حقوق کا لحاظ، یتیموں اور بیواؤں کی دیکھ بھال، مسکینوں کی خبرگیری وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں جو جامع وصایا قرآن عزیز نے کیے ہیں وہ توریت کے "احکام عشرہ" سے کہیں زیادہ جامع اور برتر ہیں۔ چنانچہ سورۂ اسراء کی یہ آیات کریمہ ملاحظہ ہوں جن میں تمام باتیں یکجا بیان کر دی گئی ہیں۔

اعمال صالحہ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۔ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا

اور تمہارے پروردگار نے قطعی حکم دیدیا ہے کہ اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ سے نیک سلوک کرو، اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو بلکہ ان سے ادب کے ساتھ بات کرو۔ ان کے سامنے نرمی کے ساتھ منکسرانہ انداز سے جھکے رہو اور ان کے لیے یوں دعا کرو کہ خدایا! جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا پوسا ہے اسی طرح تو بھی رحمت فرما۔ تمہارا پروردگار تمہارے دلی ضمیر کو خوب جانتا ہے، اگر تم سعادت مند ہو تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کر دیتا ہے۔ قرابتدار اور محتاج اور مسافر کا حق ادا کرتے رہو اور مال کو بے موقع نہ اڑایا کرو کیونکہ بے موقع دولت اڑانے والے شیاطین کے بھائی ہیں اور

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۤءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ
تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۔ وَلَا تَجْعَلْ يَدَ
كَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ
مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۔ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ
خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ
خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ
اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۔ وَلَا تَقْرَ
بُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاۤءَ سَبِيْلًا
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا
بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا
لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ
اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ
الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ
وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا
وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ
الْمُسْتَقِيْمِ ۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ
تَاْوِيْلًا ۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ
اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۤئِكَ

اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔ اگر اپنے
پروردگار کی طرف سے رزق کے آنے کی امید پر تم کو
ان لوگوں (یعنی حق داروں) سے پہلوتہی کرنی پڑے تو ان
نرمی کے ساتھ جواب دے دو۔ تم نہ تو اپنا ہاتھ گردن
ہی سے باندھے رکھو اور نہ بالکل ہی کھول دو کہ حسرت زدہ
وملامت خوردہ بنے بیٹھے رہو۔ تمہارا پروردگار جس کو
چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا
ہے تنگی کر دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے
اور دیکھتا ہے۔ تم اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشہ سے
قتل مت کرو۔ ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو
بھی بیشک ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔ اور
زنا کے پاس مت پھٹکو بلاشبہ وہ بے حیائی کی بات ہے
اور بہت ہی بُرا طریقہ ہے۔ اور جس جان کو اللہ تعالیٰ نے
حرام فرمایا ہے اس کو قتل مت کرو الا یہ کہ حق کی خاطر
ایسا کرنا پڑے اور جو ناحق قتل کیا جائے ہم نے اس کے
وارث کو (قصاص یا معاف کرنے کا) اختیار دیا ہے
پس اس کو قتل کے بارے میں حد سے تجاوز نہ کرنا
چاہیئے یقیناً (وہ اس کا مستحق ہے کہ قاتل سے بدلہ لینے
میں) اس کی مدد کی جائے۔ اور یتیم کے مال کے پاس جاؤ

كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ
مَرَحًا إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ
الْجِبَالَ طُولًا ۔ كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ
عِندَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا ۔ ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ
إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ
مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا
مَّدْحُورًا ۔ أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِينَ
وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا ۚ إِنَّكُمْ
لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا ۔ (بنی اسرائیل ۳-۴)

مگر ایسے طریقہ سے جو مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ اپنے سن
بلوغ کو پہنچ جائے۔ اور عہد کو پورا کرو بے شک عہد کی
بازپرس ہوگی۔ اور جب ناپ کر دینا ہو تو پورا پیمانہ دیا
کرو اور صحیح ترازو سے تول کر دو۔ کیونکہ یہ اچھی بات ہے
اور اس کا انجام بھی اچھا ہے اور جس بات کی تمہیں تحقیق
نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑا کرو کیونکہ کان اور آنکھ اور دل
ان سب کی بازپرس ہوگی۔ اور زمین پر اتراتے ہوئے
. . . .

نہ چلنا، تو نہ زمین کو پھاڑ سکے گا اور نہ پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔ ان میں سے ہر ایک کام تمہارے پروردگار کے نزدیک ناپسند ہے۔ یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کے ذریعہ بھیجی ہیں۔ اور خدائے برحق کے ساتھ اور کوئی معبود نہ تجویز کر لینا ورنہ تم الزام خوردہ اور راندہ ہو کر دوزخ میں پھینک دیے جاؤ گے۔ کیا تمہارے رب نے تم کو تو بیٹوں کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے اور خود اپنے لیے فرشتوں کو بیٹیاں بنا لیا ہے۔ یہ تو تم بہت ہی بڑی نازیبا بات کہتے ہو"۔

ان آیات کریمہ میں سب سے پہلے توحید فی العبادۃ کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ باری تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ تمام نیک کاموں کے لیے نقطۂ آغاز کا حکم رکھتا ہے۔ پھر اس کے بعد ماں باپ کے حقوق کا تذکرہ آتا ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ کی شان ربوبیت کا عکس اولین والدین کی تربیت و پرورش ہے اور اس لیے بھی کہ حقوق اللہ کے بعد تمام حقوق العباد میں پہلا مرتبہ والدین کے حقوق کا ہے۔ ماں باپ کی خدمت و اطاعت یوں تو ہر وقت چاہیے لیکن بڑھاپے اور کمزوری کے زمانہ میں ان کی خدمت گذاری اور بھی زیادہ

ضروری ہے، کیونکہ اس حالت میں وہ دوسروں کی مدد کے محتاج ہو جاتے ہیں قرآن کہتا ہے کہ جس طرح ماں باپ نے بچپن کے زمانے میں تمہاری پرورش، تربیت اور تعلیم میں محنت و مشقت برداشت کی، تمہاری نگرانی میں مصیبتیں جھیلیں، تم پر اپنا مال صرف کیا اور اپنے عیش و آرام کو قربان کر دیا ٹھیک اسی طرح تمہارا بھی فرض ہے کہ آج ان کے آڑے وقت میں کام آؤ۔ ان کی خدمت کرو، ان کو آرام پہنچاؤ۔ کما ربیانی صغیرا میں اسی حقیقت کو ایک حسی پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔

دنیا میں جتنے رشتے پیدا ہوتے ہیں وہ سب والدین ہی کے باعث ہوتے ہیں اس لیے حقوق والدین پر تنبیہ کرنے کے بعد ہدایت فرمائی کہ دوسرے قرابتداروں کا بھی خیال رکھنا چاہیے اور صرف رشتہ داروں تک ہی تمہاری امداد کا دائرہ محدود نہ ہو بلکہ دوسرے محتاج لوگوں کی بھی تمہیں خبر گیری کرنی لازمی ہے۔ مگر ان ہدایات کی پیروی میں کہیں ایسا نہ ہونے پائے کہ تم حدود سے تجاوز کر کے خود اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کے حقوق ضائع کر دو۔ اس لیے تبذیر کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ مال خدا کی دی ہوئی ایک عظیم الشان نعمت ہے اس کو بے محل خرچ کرنا کسی طرح زیبا نہیں اور جو لوگ خداداد دولت کی قدر نہیں کرتے یعنی اس کو رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں کی نذر کر دیتے ہیں وہ حقیقت میں شیطان کے بھائی ہیں۔ اس واسطے کہ حضرت حق جل مجدہ کی دی ہوئی نعمت کو جس طرح اس کے موقع پر نہ خرچ کرنا ناشکری ہے اسی طرح بے محل اڑا دینا بھی ناسپاسی ہے اور چونکہ شیطان اپنے پروردگار کا سب سے بڑا ناشکر ہے اس لیے جو کوئی ناشکر ہوا گویا اس کا شیطان سے رشتہ ہو گیا۔

مال اسلام کے نقطۂ نظر سے فی نفسہ اچھی چیز ہے البتہ جتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ سب بیجا استعمال سے ہوتی ہیں، اس لیے قرآن عزیز نے اس کی اصلاح فرمائی ہے اور جتنی صورتیں مال کے بے جا استعمال کی ہو سکتی تھیں ان کی روک تھام کی ہے۔ چنانچہ ایک صورت تو اس کی یہ ہے کہ انسان مال کو نہ اپنے لیے خرچ کرے اور نہ دوسروں کے لیے بلکہ جمع کرتا رہے، اور دوسری شکل یہ ہے کہ مال کو صرف اپنی خواہشات

نفسانی، آرام و آسائش، اور ضروریات پر خرچ کرے اور خوب جی کھول کر دولت اڑانے لگے مگر کسی کی ضرورت پر کچھ کام نہ آئے۔ بہرکیف ان دونوں صورتوں کو منع کر دیا گیا ہے پہلی صورت کو "اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ" میں ذکر کیا گیا ہے اور دوسری صورت کو "تبذیر" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ قرآن مجید انسان کو مالیات میں ایسی میانہ روی کی تاکید کرتا ہے جس کے سبب سے توازن نہ بگڑنے پائے کیونکہ تمام اقتصادی تباہیاں اسی سے ظہور میں آتی ہیں اور اس کا آخری نتیجہ اخلاقی تباہیوں کی شکل میں رونما ہوتا ہے اگر مالی معاملات میں افراط و تفریط دور ہو کر توازن قائم ہو جائے تو زندگی کے ہر گوشہ میں سکون و اطمینان پیدا ہو جائے۔

اسی اقتصادی سوال کے سلسلہ میں ایک بہت بڑی برائی کا ذکر کیا گیا ہے جس کو ہر زمانے کے جاہل انسانوں نے معاشی اسباب کی بنا پر اختیار کیا ہے، اور جس کا ظہور ہر جاہلیت میں کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا ہے یہ برائی قتل اطفال ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ انسان اولاد کی پیدائش کو اپنے لیے ناقابل برداشت بار سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ بچے پیدا ہوں گے تو ان کو کھلایا کہاں سے جائیگا اور ان کی پرورش کے ذرائع کہاں سے آئیں گے۔ اسی بنیادی تخیل کے تحت جاہلیت قدیمہ کے لوگ یا تو اسقاط حمل کا ارتکاب کرتے تھے، یا بچوں کو پیدا ہونے کے بعد مار ڈالتے تھے۔ اور اسی تخیل کے تحت جاہلیت جدیدہ کے لوگ برتھ کنٹرول (منع حمل یا ضبط ولادت) کے طریقے استعمال کرتے ہیں جن کو ایشیاء اور ہندوستان کے مقلدین فرنگ بھی آنکھ بند کر کے قبول کیے جا رہے ہیں حالانکہ انفرادی و اجتماعی مسائل پر اس کی جو زد پڑتی ہے وہ کسی بصیرت والے انسان پر پوشیدہ نہیں ہے، بشرطیکہ فطرت سلیمہ کی روشنی میں نظر تحقیق سے جانچ کر دیکھا جائے اور طریق نظر و فکر وہ نہ ہو جو فرنگیت مآب زندگی کے لوازم و خصائص میں سے ہے۔ قرآن مجید اس گناہ عظیم سے باز رکھنے کی تاکید کرتا ہے اور صریح الفاظ میں اُس معاشی استدلال کی تردید کرتا ہے جس کی بنا پر جہلا اپنے اس ظلم کو حق بجانب ٹھیرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو

رزق کے خزانے تو ہمارے قبضہ و اختیار میں ہیں تو اس چیز کی تم کیوں خواہ مخواہ فکر کرتے ہو۔ اس مقام پر رزق کی اضافت خاص اپنی ذات کی طرف کرکے یہ جتلا دیا کہ رزق کا مصدر اصلی ذات الٰہی ہے جس کے ادنیٰ فیضان سے بے شمار اسباب رزق و وسائل معیشت چشم زدن میں رونما ہو جا سکتے ہیں پھر اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيرًا کہکر اس کا تمدن انسانی اور عمرانیات کے لیے مضر ہونا واضح کر دیا گیا ہے۔

معیشت کے بعد تمدن کی طرف توجہ کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں اس سب سے بڑے گناہ کی ممانعت فرمائی ہے جو تمدن کی جڑ پر حملہ کرتا ہے، یعنی زنا۔ انسان اپنی حماقت سے عورت اور مرد کے صنفی تعلق کو محض شہوت رانی اور استلذاذ کا ذریعہ سمجھتا ہے، حالانکہ فطرۃ اللہ کا مقصد اس کے ذریعہ سے توالد و تناسل کا سلسلہ جاری کرنا، اور تمدن انسانی کی بنیاد رکھنا ہے۔ زنا چونکہ ان مقاصد کے حصول میں مانع ہے اور مرد و زن کے تعلق کو اس کی اصل فطری منزل مقصود سے پھیر کر دوسرے راستہ پر ڈال دیتی ہے اس لیے اس کو حرام کیا گیا۔ اسی حقیقت کی طرف اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا میں اشارہ کیا گیا ہے۔

خدائے تعالیٰ نے انسان کو مختلف قوتیں عطا فرمائی ہیں اور انہی قوائے فطریہ میں سے ایک صنفی میلان کی قوت ہے، دوسری قوتوں کی طرح اس قوت کو بھی برمحل استعمال کرنے کی نہ صرف اجازت دیگئی ہے بلکہ بعض خصوصی مواقع پر نہایت لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس قوت کے استعمال سے مطلقاً روکدینا فطرۃ انسانی پر ظلم ہوتا اور ذات خداوندی ظلم سے بری ہے۔ شریعت کی زبان میں عورت کی قوت منفعلہ اور مرد کی قوۃ فاعلہ کے برمحل اجتماع کا نام "نکاح" ہے جس کو تکمیل ایمان کا ذریعہ تبلایا گیا ہے۔ اور انہی دونوں قوتوں کے بےمحل صرف کرنے کا نام "سفاح" اور زنا ہے جس سے متعدد قباحتیں ظاہر ہوتی ہیں:۔

اوّل یہ کہ نسب میں خلط ملط ہو جاتا ہے حالانکہ انساب ہی کے ذریعہ شعوب و قبائل کا وجود ہوتا ہے، انہی کی وجہ سے آپس میں تعارف ہوتا ہے، اور تعارف ہی سے تعامل و تعاون ہونے لگتا ہے۔ جو تمدن کی

اصل ہے اس لیے زنا تمدن کے منافی ہے۔

دوسری یہ کہ جب ایک عورت ایک مرد کے لیے مخصوص نہ ہو گی تو اس سے طرح طرح کے فسادات برپا ہوں گے اور انسانی تعلقات کی ہمواری و خوشگواری میں فرق آ جائے گا۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ واقعات اس پر شاہد ہیں، چنانچہ آئے دن اخبارات میں اس قسم کی خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ فلاں نے اس لیے خودکشی کر لی کہ اس کی محبوبہ سے کسی دوسرے شخص کے ناجائز تعلقات تھے اور فلاں عورت نے محض اس لئے جان دے دی کہ اس کے عاشق نے اس سے نظر پھیر لی ہے کہیں اور سے فریفتگی ہو چکی ہے۔

تیسرے یہ کہ زنا کا مقصد صرف عیش پرستی اور شہوت رانی ہے حالانکہ زوجین کی تخلیق کا مقصد حقیقی یہ ہے کہ دونوں مل کر خانہ داری کے امور ایک دوسرے کے تعاون و تناصر سے انجام دیں، مرد باہر سے کما کر لائے اور عورت دردمندی اور کفایت شعاری سے گھر کا بندوبست کرے اور پھر دونوں کے اشتراک عمل سے اولاد کی تعلیم و تربیت ہوتی رہے۔ یہ سب باتیں اسی وقت ممکن ہوں گی جب کہ عورت کی نگاہ ایک ہی شخص پر جمی ہوئی ہو اور اس کا کسی غیر مرد سے تعلق نہ رہے۔ اسی غرض سے زنا کو حرام کیا گیا ہے۔

چوتھے یہ کہ اگر زنا کو جائز کر دیا جائے تو انسانوں اور جانوروں میں کوئی فرق نہ رہے گا اور یہ چیز شرافت انسانی کے بالکل برعکس ہو گی اس لیے نہ صرف زنا کو ممنوع قرار دیا گیا ہے بلکہ اس کے اسباب و دواعی کو بھی منع کر دیا ہے۔

زنا کے بعد دوسرا گناہ جو تمدن انسانی کو سب سے بڑھ کر نقصان پہونچانے والا ہے، قتل نفس ہے چنانچہ تحریم زنا کے بعد تحریم قتل کا ذکر فرمایا گیا۔ قرآن عظیم اس کو گناہ عظیم قرار دیتا ہے۔ البتہ چند مواقع مستثنیٰ ہیں (۱) ارتداد یعنی اسلامی احکام و اعمال سے اعتقادی روگردانی کرنا۔ (۲) حکومت اسلامیہ سے بغاوت کر کے امن عامہ میں خلل انداز ہونا (۳) نکاح ہو جانے کے بعد زناکاری کا ارتکاب کرنا۔

(۴) عمداً کسی کو مار ڈالنا۔ (۵) کفار کا مسلمانوں سے جنگ کرنا۔ انہی پانچ استثنائی صورتوں کی طرف "اِلَّا بِالحَقِّ" کہہ کر اشارہ فرمایا گیا ہے اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو قتل حرام ہے، خصوصاً قتل عمد تو بہت ہی بڑا گناہ ہے جس کی وعید اس قدر شدید الفاظ میں وارد ہوی ہے کہ :۔

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ۔ (نساء۔ رکوع ۱۳)

اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے گا تو اس کی سزا جہنم ہے ہمیشہ اس میں رہنا ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر غصہ ہو جائے گا۔ اور اپنی رحمت سے دور کر دے گا اور اس کے لیے عذاب عظیم مہیا کر رکھا ہے۔

اگرچہ یہ ایک فرعی حکم ہے لیکن اس اصل الاصول پر مبنی ہے کہ ایک مومن کو دوسرے مومن کا خیرخواہ ہونا چاہیے اور شان ایمان کا حقیقی مقتضی یہ ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن کو ناحق نہ قتل کرے کیونکہ یہ حرکت اس کی قوت ایمانی کے بالکل منافی ہوگی۔

اس آیت کے متعلق محققین علمائے تفسیر کا خیال ہے کہ یہی وہ آخری آیت ہے جو عقاب قتل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض صحابہ کرام سے یہ بھی منقول ہے کہ اس آیت کریمہ سے چند ماہ پیشتر "اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ" نازل ہو چکی تھی اس لیے آیت مغفرت آیۂ قتل کی مخصص ہے لیکن ذرا غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت مغفرت میں "لِمَنْ يَّشَآءُ" کی قید لگائی گئی ہے جس سے یہ جتلا دینا منظور ہے کہ ہر چیز شرک جیسے سنگین جرم کے اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے کہ خود ہی کسی کو اپنی مغفرت سے نوازنا چاہے تو کوئی اس کا مزاحم نہیں ہو سکتا مگر خداوند تعالیٰ نے اس مشیت سے اس مومن کو خارج کر دیا ہے جو کسی مومن کو عمداً قتل کر دے۔ درحقیقت آیت مغفرت تو ان لوگوں کی ترغیب ایمان کے لئے نازل ہوی ہے جنہوں نے اسلام سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذائیں پہنچائی تھیں۔ چنانچہ انہی لوگوں کے بارہ میں

"اِنْ یَّنْتَھُوْا یُغْفَرْ مَا قَدْ سَلَفَ" بھی نازل ہوئی ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس جو ترجمان القرآن اور حبرالامۃ ہیں صراحت فرماتے ہیں کہ قاتل عمد کی توبہ مقبول نہیں۔ وہی سورہ فرقان کی آیت "اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ" تو اس میں جو توبہ مذکور ہے وہ دراصل ان گناہوں سے تعلق رکھتی ہے جو ایمان لانے سے پہلے سرزد ہوئے ہوں۔

قاتل سے خون کا بدلہ لینا مقتول کے ولی کا حق قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں جاہلیت کے دو طریقوں کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ جاہلیت کا ایک طریقہ یہ تھا کہ مقتول کے ورثا صرف قاتل ہی کے نہیں بلکہ اس کے بھائی بندوں اور اس کی اولاد تک کے دشمن ہو جاتے تھے اور ان سے بھی بدلہ لیا کرتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ بطور خود بدلہ لے لیا کرتے تھے اور کسی نظام عدل و قانون سے مدد لینے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے۔ ان دونوں طریقوں کا نتیجہ فساد کی اشاعت تھا اور ان میں انصاف کی حد سے تجاوز بھی تھا اس لیے قرآن حکیم نے ان دونوں کی ممانعت کر دی۔ "فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ" کا مطلب یہ ہے کہ قاتل کے فعل کا بدلہ اس کے کسی عزیز رشتہ دار سے لینا زیادتی ہے، اور "اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا" سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قاتل سے بھی ولی مقتول کو خود بدلہ نہ لینا چاہیئے۔ بلکہ یہ کام اسلامی حکومت کا ہے کہ وہ انتقام لینے میں اس کی مدد کرے۔

آگے چل کر یتیموں کے حقوق کی حفاظت پر توجہ فرمائی گئی ہے۔ یہ جو ارشاد ہوا کہ مال یتیم کے قریب بھی نہ پھٹکو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے مال کو ہاتھ ہی نہ لگایا جائے اور اس کے مال کی نگرانی بھی نہ کی جائے اور اسے یونہی چھوڑ دیا جائے بلکہ اصلی مقصد یہ ہے کہ ایمانداری خیر خواہی اور مصلحت شناسی کے ساتھ تصرف کیا جائے یعنی اس کے مال کو تجارتی کاروبار میں لگا رکھیں جس سے مال بڑھتا رہے اور اگر یتیم کی کفالت پرداخت اور تعلیم و تربیت میں تمہارے اوقات لگ جاتے ہوں اور تمہیں پھر

کسی دوسرے کام کا موقع نہ رہتا ہو تو اپنی ضرورت کے مطابق اس کے مال میں سے لے سکتے ہو۔ نیت بخیر ہونی چاہیے۔ یتیم کا مال اس خیال سے نہ اڑا دیا جائے کہ بڑا ہو کر اپنا مال ہم سے وصول کرے گا۔ اور جو کوئی یتیم کی نگرانی کرنے والا مفلس و محتاج نہ ہو بلکہ اپنے گھر کا خوش حال اور صاحب ثروت ہو تو اس کو مال یتیم کے لینے سے بچنا چاہیے کہ یہی تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔ پھر جب یتیم سن رشد کو پہنچ جائے تو سرپرست اس کو آزما کر دیکھے کہ اس میں معاملات کی اصلاحیت پیدا ہو گئی یا نہیں اگر اپنی آپ دیکھ بھال کر لینے کا سلیقہ پیدا ہو چکا ہو تو مال واپس کر دینا چاہیے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَا اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ۔ (سورہ نساء۔ رکوع ۱)۔

تم یتیموں کو آزما لیا کرو یہاں تک کہ جب وہ (عمر) نکاح کو پہنچ جائیں اور ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو تو ان کے مال ان کے حوالہ کر دو۔ ان کے مال کو ضرورت سے زیادہ خرچ کر کے اور یہ خیال کر کے کہ یہ بڑے ہو کر واپس لے لیں گے مت کھاؤ۔ جو شخص مال دار ہو اسے تو یتیم کا مال کھانے سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے اور جو شخص فقیر ہو وہ مناسب مقدار کھا سکتا ہے۔

مال یتیم کے متعلق ہدایات فرمانے کے بعد عہد کی پابندی کے متعلق تاکیدی حکم دیا جاتا ہے۔ عہد کی چند قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان ہو، دوسرا وہ جو بندوں کے باہم ہو، تیسرا عہد و پیمان وہ ہے جو خود انسان اپنے آپ سے کرلے۔ حکم ربانی ان تینوں کی پابندی سے متعلق ہے۔ البتہ وہ عہد و پیمان جو شریعت کے خلاف ہو وہ اس مفہوم ہی میں داخل نہیں ہے، اس لیے اس کی پابندی لازم نہیں۔

اس کے بعد معاملات میں سے ایک خاص قسم کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ اہمیت

رکھتی ہے یعنی یہ کہ ناپ تول میں کمی نہ کرنی چاہیے بلکہ ٹھیک ٹھیک ناپنا اور تولنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ تم کو آخرت میں ثواب ملے گا۔ بلکہ دنیا میں بھی اس کا فائدہ اس طرح محسوس ہوگا کہ تمہاری تجارت فروغ پائے گی، دوکانداری چمک اٹھے گی، لوگ جوق در جوق گاہک بن کر کھنچے چلے آئیں گے اور تمہارا کاروبار خوب ترقی کر جائے گا۔" ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا سے یہ دونوں باتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اسلام دنیا و آخرت دونوں کی برکات سے مستفید ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ تجارتی کاروبار میں خیانت نہ صرف ایک بدترین اخلاقی جرم ہے بلکہ خود کاروبار کے لیے بھی مہلک ہے۔ جس قوم میں یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے اس کی ساکھ دنیا سے اٹھ جاتی ہے، اس کی تجارت ملیا میٹ ہو جاتی ہے اور اس پر معاشی تباہی مسلط ہو کر رہتی ہے۔ اسلام ان دونوں برے نتائج سے بچانا چاہتا ہے اس لیے اس نے تجارتی اخلاق کی اصلاح پر بڑا زور دیا ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ ایماندار تاجر جنت میں انبیاء و صدیقین و شہداء کے ساتھ ہوگا۔ اسی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں (Honesty) کی حیثیت محض ایک اچھی پالیسی کی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کو ایمان کا مترادف سمجھتے ہیں۔ ان کی زبان میں (Honesty) کے لیے ایمانداری کا لفظ مستعمل ہوتا ہے (Dishonest) کو وہ بے ایمان کہتے ہیں۔

معاملات میں تمام تر خرابیاں اس سے پیدا ہوتی ہیں کہ انسان بسا اوقات ان ذرائع معلومات پر اعتماد کر لیتا ہے جو دراصل بھروسہ کے قابل نہیں ہوتے، اور ان کی بنیاد پر نہ صرف یہ کہ خود غلط رائے قائم کرتا ہے، بلکہ اس غلط رائے کا اظہار دوسروں کے سامنے بھی کر گذرتا ہے۔ اسی سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں، تہمتیں لگتی ہیں، غیبتوں کا سلسلہ چلتا ہے، دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں، اور خدا جانے کتنے فسادات پھیلتے ہیں۔ قرآن عظیم نے "لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" فرما کر ایک ایسا جامع کلیہ بیان کر دیا کہ اگر انسان اس کی پیروی کرے تو یہ تمام خرابیاں خود بخود دور ہو جائیں۔" ایسی چیز کے پیچھے نہ پڑو جس کی

تمہیں تحقیق نہ ہو، اور یہ سمجھ لو کہ آنکھ، کان اور دل سب سے پرسش ہوگی"۔ اس کے بعد تم دیکھو گے کہ بدگمانی اور بدگوئی اور بدنیتی کا بیج ہی مرجائے گا۔

پھر تکبر کی مذمت نہایت بلیغ پیرایہ میں کی جاتی ہے کہ تم زمین پر جو اترا کر چلتے ہو اس سے نہ زمین پھٹ سکتی ہے اور نہ تم پہاڑوں کی اونچائی سے بلند ہو سکتے ہو پھر کیوں نہ تواضع اور انکساری اختیار کرو؟

سورۂ اسراء کی ان آیات کے علاوہ جن کی ہم نے کسی قدر تشریح کر دی ہے بے شمار آیتیں ہیں جن میں اچھے اعمال اور عمدہ اخلاق و فضائل پر ابھارا گیا ہے اور ان اعمال سے باز رکھا گیا ہے جو دینی، دنیوی، جانی، اور مالی کسی حیثیت سے نقصان رساں ہیں۔ بالخصوص نفسانی خواہشات کی پیروی، شیطانی وساوس کے اتباع اور ائمۂ شر کی اطاعت سے بہت سختی کے ساتھ روکا گیا ہے کیونکہ یہی تمام قبائح کی جڑ ہے۔ انہی امور سے احتراز و اجتناب کرنے کا نام "تقویٰ" ہے اور یہ ایک ایسا جامع کلمہ ہے جس کے اندر ہر وہ چیز آ جاتی ہے جو انسان کو گندگیوں اور آلودگیوں سے بچانے والی ہو اور دنیا و آخرت دونوں میں اس کو خسران و نامرادی سے محفوظ رکھنے والی ہو۔ اسی لیے تقویٰ کا ذکر کبھی تو دینی احکام کے ذیل میں آتا ہے اور کبھی ازدواجی مسائل کے سلسلہ میں، اور کسی وقت معاشرتی و سیاسی امور کے تحت، کیونکہ اوامر و نواہی کے امتثال کی جڑ یہی ہے۔

قرآن حکیم نے اعمال صالحہ کو بالاجمال اصولی طور پر بیان کیا ہے تفصیل سے کام نہیں لیا تاکہ ازمنہ و امکنہ کے لحاظ سے اس کی فرعی تعبیر درست ہو۔ انہی اعمال صالحہ کے سلسلہ میں وہ عبادتیں بھی آ جاتی ہیں جن پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے کیونکہ وہ ایک طرف خدا کے ساتھ بندے کا تعلق مضبوط کرتی ہیں، اور دوسری طرف انسان کے نفس کی اندرونی کثافتوں کو دور کر کے اسے عملاً صالح بنا دیتی ہیں۔

نماز: قرآن عزیز نے اعمال و عبادات میں سب سے زیادہ نماز پر زور دیا ہے اور ایمانیات کے

بعد عملی زندگی میں اسی کا درجہ سب سے مقدم ہے۔ عرب کے مشرکین میں بھی ایک مخصوص طریقۂ عبادت کا نام صلوٰۃ تھا جس کا قرآن حکیم نے ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً (سورۂ انفال۔ رکوع ۴)

بیت اللہ کے پاس ان کی نماز بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ تالیاں ٹھوکتے اور سیٹیاں بجاتے تھے

لیکن جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے نماز کے اس طرز کی اصلاح فرمائی اور اس کی تدریجی طور پر ایک خاص وضع وہیئت مقرر کر دی اور خصوصیت کے ساتھ اس کی پابندی پر زور دیا کیونکہ اس میں انفرادی و اجتماعی اور مادی و روحانی دونوں قسم کی برکتیں رکھی گئی ہیں اور انسانی اخلاق کی بلندی و برتری کے لیے اس سے بہتر کوئی کفیل نہیں۔ چنانچہ نماز کی غرض و غایت کو خداوند قدوس نے ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ۔ (سورۂ عنکبوت۔ رکوع ۵)

اور نماز قائم رکھو (اس لیے) نماز بے شک وشبہ بداخلاقیوں اور برائیوں سے بچاتی ہے اور اللہ کو یاد کرنا بڑی بات ہے۔

قرآن عزیز نے انسانی اخلاق کی اصلاح کے لیے نماز ہی ایک ایسی عبادت مقرر کی ہے جس کے ذریعہ تمام اخلاقی کمزوریاں زائل ہو جاتی ہیں کیونکہ تمام اخلاقی کمزوریاں فحشار و منکر سے پیدا ہوتی ہیں اور نماز فحشار و منکر سے بچاتی ہے۔ فحشار تمام قبیح کاموں کو کہتے ہیں اور منکر وہ ہے جس کی اسلامی قانون میں مطلق اجازت نہ ہو۔ پس اب ہمیں اس آیۂ کریمہ پر غور کرنا چاہیے کہ نماز فحشار و منکر سے کیونکر بچاتی ہے۔

نماز حقیقت میں تین چیزوں سے مرکب ہے۔ اخلاص، خدائے تعالیٰ کا خوف، اور قرآن پاک کی تلاوت، پہلی چیز کے ذریعہ انسان کے اندر ایک ایسی حقیقت پیدا ہو جاتی ہے جو اسلامی عبادتوں

کی روح اور اسلامی احکام کا خلاصہ اور لب لباب ہے۔ اسی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "احسان" سے تعبیر فرمایا ہے۔ دوسری چیز خوف خدا ہے جس کی وجہ سے انسان کی ہر ایک نقل و حرکت پر محض قانونی حد تک پابندی نہیں رہتی بلکہ اس کے ساتھ یہ صحیح خیال ذہن میں راسخ ہوجاتا ہے کہ کوئی ایسا زبردست حاکم مطلق ہے جو ہماری بدعملیوں اور نافرمانیوں پر ہر وقت خبردار رہتا ہے اور ضرور وہ ہم سے ایک نہ ایک دن سخت بازپرس کرے گا۔ گویا مبداء و معاد کا صحیح تصور اللہ تعالیٰ کی خشیت سے پیدا ہوتا ہے اور خشیت الٰہی نماز سے۔

تیسری چیز نماز میں تلاوت قرآن ہے جس کے ضمن میں ہر وقت خدا کے احکام اور اوامر و نواہی کان میں پڑتے رہتے ہیں۔ بظاہر یہ ناممکن ہے کہ ایک مسلمان کے کان میں خدا کی آواز بار بار پہنچتی رہے اور وہ اس پر بھی اپنی بدعنوانیوں سے باز نہ آئے یہی باعث ہے کہ بعض اہل تفسیر نے اس موقع پر کہا ہے کہ فحشاء و منکر سے باز رکھنا نماز کا فعل نہیں بلکہ اس تلاوت قرآن کا ہے جو نماز میں کی جاتی ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ فحشاء و منکر سے روکنے والی چیز نماز ہی ہے کیونکہ نماز پڑھنے والا نماز کی مشغولیت میں بہت سی برائیوں سے بچ سکتا ہے اگر وہ نماز کو نماز سمجھ کر پڑھے اور اس کی جتنی ظاہری و باطنی شرطیں ہیں پورے طور پر بجا لائے اور جس قدر اس کے لوازم ہیں اُن کے ادا کرنے میں سرمو کوتاہی نہ کرے تو اس کی نماز اس کو فحشاء و منکر سے ضرور بچائے گی اور کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے اس کو آشنا کرکے رہے گی چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۔ (مومنون ۔ رکوع ۱۰)

یقیناً وہ ایمان والے کامیاب ہوچکے جو اپنی نمازوں میں خشوع رکھنے والے ہیں۔

اس کے علاوہ انسان کی ساری کمزوریاں اور اس کی اضطراب انگیز کیفیتیں محض جزع و فزع سے پیدا ہوتی ہیں نماز سے اس کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا وَّ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا وَّ اِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ مَنُوۡعًا اِلَّا الۡمُصَلِّيۡنَ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَلٰى صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ فِىۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ وَالَّذِيۡنَ يُصَدِّقُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ ۔ (سورہ معارج رکوع ۱)	بیشک انسان کم ہمت پیدا کیا گیا ہے جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرنے لگتا ہے اور جب فارغ البالی ہو جاتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے مگر وہ نمازی اس سے مستثنیٰ ہیں جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں اور جن کے مال میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں کا حق ہے اور جو یوم الدین کی تصدیق کرتے ہیں ۔

نماز کے حقائق و اسرار کی مزید وضاحت منظور ہو تو ایک غائر نظر ڈالکر دیکھو کہ نماز کیا چیز ہے؟ نماز حقیقت میں انسان اور اس کے حقیقی مالک اور علی الاطلاق حاکم کے درمیان بندگی کے تعلقات استوار کرتی ہے اور اس میں وہ روحانی و اخلاقی طاقت پیدا کرتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی بہیمی قوتوں کو ملکوتی طاقتوں کے تابع کر سکتا ہے ۔ انسانی زندگی میں صحیح نظم و ضبط اور اعتدال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ اس کی بہیمیت اس کی ملکیت کے تابع رہ کر کام کرے ۔ غور کرو ایک انسان دوسرے انسان کی جان و مال اور اس کی عزت پر اسی لیے تو ہاتھ ڈالتا ہے کہ اس کے سرکش نفس امارہ کی بہیمیت اس کو ایسی بری حرکتوں پر ابھارتی ہے ۔ اگر یہ بہیمیت دب جائے اور انسانیت اس پر غالب آجائے تو وہ خود ایسی حرکتوں سے رک جائے گا بغیر اس کے کہ خارج میں کوئی طاقت اسے روکنے والی ہو اسی لیے خداوند قدوس نے اسلامی عبادتوں میں ایسی تاثیر رکھدی ہے کہ ان کے ادا کرنے سے ملکوتی اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ جب حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے آیت اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ " واقعی نماز میں خدا کی نافرمانیوں سے باز رکھنے اور روکنے کی صفت ہے " ۔ اور جب حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی خدمت میں ایک شخص کا حال بیان کیا گیا کہ " وہ نماز بہت پڑھتا رہتا ہے " تو کہنے لگے نماز اس شخص کو فائدہ پہونچاتی ہے

جو نماز کی اطاعت کرتا ہے اور نماز کی اطاعت سے مراد یہ ہے کہ نماز درست طریقہ پر اس کے حقوق ادا کر کے پڑھی جائے۔

ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری سے پوچھا گیا کہ "قَالُوا یَا شُعَیْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ" (اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں حکم کرتی ہے) اس آیت کا مطلب کیا ہے؟ تو سفیان نے صاف کہا کہ ہاں نماز حکم بھی دیتی ہے اور منع بھی کرتی ہے اور جو شخص نماز تو پڑھتا ہے مگر اس کی نماز اس کو اخلاقی برائیوں سے نہ روکتی ہو تو اس کو خدائے قدوس کی بارگاہ میں نزدیکی ہونے کے بجائے دوری و مہجوری ہونے لگتی ہے۔

اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خداوند عالم نے اسلام کو ساری دنیا کے مذاہب پر برتری عطا فرمائی ہے مگر کسی قوم کا بلند معیار پر پہنچ جانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کے افراد بلند معیار پر نہ ہوں اور کسی شخص کے لیے بلند مرتبہ پر فائز ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اس کا ذاتی کیریکٹر درست نہ ہو جائے کیونکہ کیریکٹر کی عظمت ہی اس کو ایک اعلیٰ زندگی دلا سکتی ہے اور اس گم گشتہ متاع کی تلاش نماز ہی میں ہو سکتی ہے۔

کاش اس فرنگیت مآب، زمانہ کے روشن خیال اس حقیقت کبریٰ کو سمجھ لیں تو ان میں ایک انقلاب ہو جائے اور اپنی تمام گذشتہ رفعتوں اور عظمتوں کے لوٹنے کی صحیح امید کی جا سکے مگر افسوس کہ آج کل ذہنی غلامی کا دور دورہ ہے اور بہت سے مسلمان ہیں جو اپنی روشن خیالی کے زعم باطل میں مبتلا ہیں اور اس بہترین اسلامی عبادت کو جو نہ صرف روحانی بلکہ مادی فوائد پر بھی مشتمل ہے ایک پرانی رسم اور عہد قدیم کی یادگار سمجھتے ہیں۔ اگر ان مسلمانوں میں قرآن عزیز کے پڑھنے اور اس میں غور و فکر کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ نماز کی حقیقت اور اس کے اسرار و مصالح پر مطلع ہو کر اپنی کوتاہی کی تلافی کریں گے۔

زکوٰۃ اسی طرح زکوٰۃ بھی دینِ اسلامی کے بنیادی اعمال میں سے ہے اور اس کا اجتماعیات سے بہت گہرا تعلق ہے درحقیقت انسان کے اندر سے بخل کی صفت نکالنے والی یہی عبادت ہے کیونکہ جب تک یہ خبیث جذبہ نہ نکل جائے انسان کے اندر عمدہ اخلاق اور اچھے ملکات پیدا نہیں ہوسکتے اور یہی وہ جذبہ ہے جس کی وجہ سے انسان کے دل میں سرمایہ داری کی محبت کچھ اس قدر رچ جاتی ہے کہ وہ پھر نہ بنی نوع انسان کا خیر خواہ ہو سکتا ہے اور نہ دینی و ملی مقاصد کی کچھ وقعت کرتا ہے بلکہ اپنے ہی اغراض کا بندہ بن کر ہر جائز و ناجائز طریقے سے سرمایہ کی فراہمی میں لگ جاتا ہے۔ اسی لیے زکوٰۃ فرض کی گئی ہے کہ ان برائیوں سے انسان کو محفوظ و مصئون رکھا جائے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (سورہ توبہ رکوع ۱۳)

تم ان کے مال میں سے صدقہ مفروضہ لو جس کے ذریعہ تم ان کو پاک اور صاف کردو گے۔

نماز اور زکوٰۃ کا قرآن عزیز اتنی مرتبہ بار بار ذکر کرتا ہے کہ ان کا استیعاب دشوار ہے۔ ان دونوں کی حقیقت اور اہمیت ذہن نشین کرانے کے لیے اس قدر مختلف اسالیبِ بیان اختیار کرنا ضروری تھا مگر بایں ہمہ زکوٰۃ کی تفصیل نہیں کی گئی بلکہ صرف فرضیت پر زور دے کر اس کے اسرار و حکم پر مطلع کر دیا گیا اور ان مقامات کو بیان کر دیا گیا جہاں زکوٰۃ خرچ کی جائے چنانچہ فرمایا جاتا ہے

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللهِ وَاللهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (سورہ توبہ رکوع ۸)

صدقات مفروضہ صرف فقیروں اور مسکینوں کا حق ہے اور جو کارکن ان صدقات (کی وصولیابی اور انتظام) پر مقرر ہیں اور وہ لوگ جن کی دلجوئی کرنا ہے اور غلاموں کو آزاد کرنے میں اور قرضداروں کے قرضہ میں اور اللہ کے راستہ میں اور مسافروں میں۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر کیا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ علم والا اور حکمت والا ہے۔

اس کی جزئیات کی تشریح قرآن نے نہیں کی بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی اس کے واسطے ایک معیار قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ فرمان خداوندی ہوتا ہے۔

لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک اچھا نمونہ ہے

بہرکیف زکوٰۃ ایک زبردست عبادت ہے جس میں بہت سی خوبیاں مضمر ہیں۔ چنانچہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ ابن جبل رضؓ کو یمن کا گورنر بنا کر روانہ کیا تو ان کو چند ہدایات فرمائیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جب تم وہاں پہنچو تو یمن والوں کو سمجھاؤ کہ خداوند تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے سرمایہ داروں سے لی جائے گی اور انہی کے غریبوں پر تقسیم کر دی جائے گی۔

درحقیقت یہی اسلام کا معتدل قانون ہے جن پر عمل کرنے سے سرمایہ دار اور مزدور کی موجودہ کش مکش ختم ہو سکتی ہے اور افراط و تفریط کے ان نظامات کا استیصال ہو سکتا ہے جو کیپٹلزم، کمیونزم اور فاشزم کی صورت میں دنیا کے امن کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ (باقی)

مسلمان اور امامت کبریٰ

از جناب مولوی صدر الدین صاحب مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ

فطرۃ اللہ جو لوگ شریعت حقہ کی فہم و بصیرت میں ادنیٰ درک بھی رکھتے ہیں اور اس کے آئینہ میں اقوام کے فلسفۂ تخریب و تعمیر کا حقیقی عکس دیکھنا چاہتے ہیں ان کے سامنے نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کی لغویت پہلے ہی قدم پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جتنی قومیں بھی دنیا میں ابھری یا گری ہیں سب کا سررشتہ ایک محکم ضابطہ اور ایک بے لچک قانون سے بندھا ہوا ہے' اس ضابطہ اور اس قانون کو قرآن فطرۃ اللہ یا سنۃ اللہ کہتا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ دیکھو قدرت کا یہ ناموس ازلی اور غیر متبدل ہے۔ اس کے اصولوں کو مانو اور اس کے اشارہ پر قدم اٹھاؤ تو تم یقیناً خدا کے محبوب بھی ہو اور لاڈلے بھی' پھر اس کی خلافت کا تخت تمہارے پیروں تلے ہوگا اور کائنات کی زمام قیادت تمہارے ہاتھوں میں ہوگی۔ دنیوی نعمتوں اور اخروی سعادتوں کے مستحق تمہیں ہو۔ لیکن اگر تمہاری روحوں نے اس قانون سے بغاوت کی اور تم نے اپنی اہواء و آراء کے سانچے میں نظام عالم کو ڈھالنا چاہا تو پھر نہ تمہارا پیغمبروں کی اولاد ہونا تمہیں بربادی و ملعونیت سے بچا سکتا ہے اور نہ خیر الامم اور افضل العٰلمین ہونا تمہارے حق میں سفارش کر سکتا ہے۔ غرض تم ابھروگے تو اپنی نیک کرداریوں سے اور گروگے تو اپنی بداعمالیوں سے ورنہ قدرت تو بالکل بے نیاز ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (رعد ۲)

اسی فلسفہ عروج و زوال کو اصطلاح جدید میں "بقاء اصلح کا قانون" کہتے ہیں۔ کتاب الٰہی نے اس قانون کو اصل الاصول قرار دیا ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسی مخلص اطاعت شعار

اور حق آگاہ جماعت اور کونسی ہوئی ہے یا ہو سکتی ہے اور انبیاء کرام کے بعد خدا کے نزدیک ان سے بڑھ کر محبوب یا رعایت کا حقدار اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے لیے بھی خدا کا یہ قانون بے لچک اور غیر متبدل ہی تھا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۔ الآیۃ (مائدہ ۱۲)

اے ایمان والو تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ عنقریب ایک ایسی قوم برپا کر دے گا جو اسے چاہے گی اور وہ اسے چاہے گا، یہ قوم مومنین کے لیے نرم اور کافرین کے حق میں سخت ہو گی۔

ایک مرتبہ جہاد کے موقع پر بعض ضعفاء القلوب نے جبانت اور بزدلی کا مظاہرہ کیا تو یہ پر عتاب آیۃ نازل ہوئی:۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (توبہ)

اگر تم نہ نکلو گے (جہاد کے لیے) تو خدا تم کو دردناک عذاب دیگا اور تمہارے بدلہ ایک دوسری قوم لائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور آگے بڑھیے، جو دنیا میں خدا کی خاص محبوبیت کا پیکر بن کر آیا، جس کے مقام تقرب تک پہنچنے میں جبرئیل کے بھی پر جلنے لگے جو اپنے رب کے اتنا قریب جا پہونچا تھا کہ اس کی انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینے پر محسوس کرتا تھا جو معصوم تھا بلکہ سارے معصوموں کا سردار اس کے لیے بھی سنت الٰہی اپنی اسی آن پر وہی کھول کر کہدیا گیا کہ:۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ

یہود و نصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے تاوقتیکہ تم ان کے طریقہ کی پیروی نہ قبول کر لو۔ کہدو کہ راہ ہدایت تو صرف اللہ کی ہدایت ہے ورنہ اگر تم نے ابھی

بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ اہواء کی پیروی کی علم آجانے کے بعد تو پھر (یاد رکھو)
مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ۔ (بقرہ) خدا کے مقابلہ میں تمہارا کوئی ولی اور ناصر نہ ہو سکے گا

قانون الٰہی کے مختلف دفعات میں سے ایک مسلّم اور اٹل دفعہ یہ بھی ہے کہ مشرک خدا کی بخشش کا مستحق کبھی نہیں ہوسکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ یہ ایک قضائے مبرم ہے جس میں کبھی تخلف نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ اگر پیغمبر بھی (نعوذ باللہ) اس جرم کا مرتکب ہوجائے تو اس کے لیے بھی خدائے ذوالجلال کی قہرسامانیاں اتنی ہی بے پناہ ہیں جتنی دوسرے کے لیے بلکہ اس سے دوگنی۔

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَضِعْفَ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تم کو ضرور چکھائیں گے دگنا
الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا (عذاب کا) زندگی میں اور موت میں پھر تم ہمارے خلاف
(بنی اسرائیل ۸) کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔

غرض خدا کی سنت ازل سے ایک حال پر ہے اور ابد تک باقی رہے گی۔ منصۂ شہود پر جو جزئی واقعہ بھی پیش آتا ہے سب کا سب اسی جلوۂ حقیقت کا ایک خارجی اور مادی عکس ہوتا ہے جسے نگاہیں بآسانی بھانپ سکتی ہیں بشرطیکہ ان میں بینائی ہو۔ آگے جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ اسی اجمالی حقیقت کی تفصیل ہے۔

خلافت الٰہی انسانی شرف و مجد کا راز یہ ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر اس کا خلیفہ ہے۔ خلافت الٰہی کا تاج اس کے سر پر ابتدائے آفرینش ہی میں رکھ دیا گیا تاکہ وہ خدا کی اس زمین پر اس کے احکامات کا نفاذ کرے۔ اسی غرض کی تکمیل کے لیے مبشرین اور منذرین کا ایک کثیر التعداد گروہ مختلف زمانوں میں مختلف اقوام و ملل کے اندر آتا رہا ہے۔ جب خدا کی مشیت اور حکمت کسی قوم کو نوازنا چاہتی ہے تو اس کے سر پر اس مقدس تاج کو رکھ دیتی ہے جس سے جمال انسانیت کی شعاعیں چھن چھن کر دنیا سے ظلمت کو مٹاتی

اور انسانی سعادت کی راہیں دکھلاتی ہیں۔ یہ تاج اس قوم کے سر پر اس وقت تک رہتا ہے جبتک اس کے اندر اس کی اہلیت ہوتی ہے لیکن جب اس قوم پر نفس کا تسلط اور شیطان کا استیلاء ہو جاتا ہے اور وہ نوامیس الٰہی کے حدود توڑتی اور اپنی خواہشات نفس میں ڈھلے ہوئے قوانین ان کی جگہ قائم کرتی ہے تو اس کے سر سے یہ زرین تاج اتار لیا جاتا ہے اور ظلمت و حیرانی کے ہیبت انگیز بیابانوں میں اسے سرگرداں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کی معزولی تاریخ یہود اس حقیقت کا سب سے کامل مظہر ہے، جہاں ہمیں تصویر کے دونوں رُخ حقائق اور واقعات ثابتہ کی روشنی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ وہ قوم تھی جسے خدا نے تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت دی تھی جس کی تائید و نصرت کے لیے بحر قلزم کی موجیں اور قضائے آسمانی کی مدڈیاں ہی ہمہ تن تیار نہ رہتیں بلکہ خود مرکز فتح و نصرت اور منبع فیض و رحمت ابر بن کر آتا اور ان کے سر پر سایہ کرتا ہوا چلتا لیکن آخر یہ ساری رحمتیں، یہ تمام نوازشیں یہ سب ناز برداریاں کہاں گئیں اور ان کی شان محبوبیت کس گوشہ میں جا کر روپوش ہوگئی اس وقت جبکہ ان کے ناز بردار خداوند کے تیور بدل گئے اس کی پرجلال نگاہوں سے قہرمانیوں کے شعلے نکلنے لگے، اُس کے بے پناہ قوتوں والے ہاتھوں نے ان کے سروں سے خلافت کا تاج چھین لیا یہاں تک کہ اس نے ان سے تبری اور نفرت کا اعلان کر دیا۔ مغضوب علیہم اور قاسیۃ القلوب کہکر ان کے دلوں پر مہر کر دی کہ پھر سعادت اور حقانیت کی نورانی کرنیں ان کے اندر کبھی نہ گھسیں، ملعون اور مفسد قرار دیکر انھیں ایک مظہر عبرت بنا کے چھوڑ دیا کہ دنیا ان سے درس عبرت حاصل کرے۔ آخر یہ انقلاب کیسے وجود میں آیا؟ اس کا جواب قرآن تصریحاً یا کنایۃً قدم قدم پر پیش کرتا جاتا ہے۔ قدرت جب اپنے ان لاڈلوں سے عہد و پیمان مرتب کر رہی تھی تو اس وقت اس نے اپنے مراحم کی اساس ہی یہ بتلائی تھی، اَوْفُوْا بِعَھْدِیْ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ۔ پھر جب ان وعدہ شکنوں نے میثاق الٰہی کی بے حرمتی کی اور خدا کی شریعت کو اپنی

اپنی ہوا و ہوس کی آماجگاہ بنا کر اسے فراموش ہی کر دیا تو اس نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ
چنانچہ حضرت موسیٰ نے جب فرعون کے دربار میں توحید کی آواز بلند کر کے بنی اسرائیل کی
رہائی کا مطالبہ کیا اور اس کے جواب میں فرعون نے طرح طرح کے انسانیت سوز مظالم ڈھانے شروع
کر دیئے تو بنی اسرائیل ان مصائب کی تاب نہ لا کر چیخ اٹھے کہ اے موسیٰ تو تو ہمارے لیے عذاب بن گیا
صرف تیری وجہ سے تیرے آنے سے پہلے ہی ہمارے ہزاروں معصوم لخت جگر موت کے آغوش میں سلائے
گئے اور پھر آج تک ہمارے مصائب کا دروازہ بند نہ ہوا اس وقت آپ نے فرمایا۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (اعراف ۱۵)

قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں زمین کی خلافت دے دے پھر دیکھے کہ آخر تم کیسا عمل کرتے ہو۔

یعنی جب خلافت اور دنیا کی شہنشاہی کا تصور بھی ان کے ذہن میں نہ آ سکتا تھا اس وقت اس
منصب جلیل کی بشارت سنا کر آگاہ کر دیا گیا تھا کہ یہ نعمت تمہیں دے کر تمہارے اعمال کو دیکھا اور
تمہاری صلاحیت کار اور اہلیت کو پرکھا جائے گا۔ چنانچہ یہ خداوندی بشارت بھی اسی سنت اللہ
کے ماتحت عالم وجود میں آئی اور اللہ کا یہ کلمۂ حسنیٰ اسی وقت پورا ہوا جب وہ امتحان کی کسوٹی پر
پورے اتر گئے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا۔ (اعراف ۱۶)

اور بنی اسرائیل پر تمہارے رب کا نیک وعدہ پورا ہوا بوجہ ان کے صبر کرنے کے۔

سورۂ بقرہ جو کہ اثبات نبوت کی سورۃ ہے اس کا خطاب سراسر یہود سے ہے جس کے اندر
ان کی اس شقاوت و ملعونیت کی الم ناک داستان واقعات کی روشنی میں پوری تفصیل کے ساتھ
پیش کی گئی ہے اور یہ نتیجہ نکالنے کے بعد کہ تمہاری امت کا یہ کھوکھلا پیکر اس قابل نہیں رہا کہ اسے

نیابت الٰہی کی زرین خلعت پہنائی جائے۔ ایک جدید امت کی تعمیر کی ضرورت ظاہر ہوگئی ہے۔

یہود کے اسباب زوال کا یہ ایک کلی اشارہ ہے آگے چلکر حسب موقع اس کی مزید تشریح کیجائیگی۔

خیر الامم کی بعثت دین الٰہی کے جس قصر مشید کی بنا وادی غیر ذی زرع میں خلیل اللہ نے ڈالی تھی اس کی تعمیر و تخریب کے نہ معلوم کتنے دور گذر رے لیکن مشیت ایزدی کے نزدیک اس کی تکمیل ضروری قرار پاچکی تھی۔ بالآخر وہ وقت آیا کہ اس ایوان کی آخری اینٹ رکھدی گئی جس کے بعد اس کا کوئی گوشہ ناکمل باقی نہ رہا اور شرائع و ہدایات کا جو سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا تھا اس کی تکمیل کا اعلان کردیا گیا۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الآیہ یعنی جو آفتاب جمال سینا اور شعیر سے طلوع ہوا تھا وہ بلند ہوکر اپنی پوری تابانیوں اور ضیا گستریوں کے ساتھ فاران کی چوٹیوں پر چمکا۔ خدا نے بیت قدس سے توجہ ہٹا کر بیت حرام کو اپنی اتمامی نعمتوں کا مہبط قرار دیا اور پھر یوں ہوا کہ وہ خلعت سعادت جسے بنی اسرائیل کے منحوس پیکر سے اتار لیا گیا تھا، کہ اب وہ اس کے اہل نہ رہے تھے، ریگزار عرب کے بدوں کو پہنا دیا گیا۔ عزل و نصب کا یہ سلسلہ تو ابتدائے آفرینش ہی سے چلا آتا تھا۔ اور سنت الٰہی برابر نااہل اور ناکارہ قوم کو ذلت اور لعنت کے حضیض میں ڈھکیلتی اور اس کی جگہ ایک دوسری صالح قوم کو برپا کرکے خلافت کا تاج قدوسیت اس کے سر پر رکھتی رہی ہے لیکن یہ عزل و نصب بعض اعتبارات سے بالکل ہی ممتاز اور انوکھا تھا کیونکہ یہ لمحہ وہ تھا جو تاریخ قیادت کی دو مختلف النوع حقیقتوں کا مرکز اتصال تھا۔ اب تک جو قومیں قدرت کے انتخاب میں آتی رہی تھیں ان کی شریعت بھی محدود تھی اور ان کی سیادت بھی محدود۔ عقل انسانی کا دائرہ اس وقت اتنا وسیع نہیں ہوا تھا کہ اس کی ہدایت کے لیے کسی کامل اور غیر متبدل شریعت کی ضرورت پڑتی اور نہ اس نے اتنی ترقی قوت حاصل کی تھی کہ پورے عالم کی گلہ بانی کے بار کی متحمل ہوسکتی، یا اس کلام الٰہی کی روحانی تجلیات کو اپنے اندر جذب کرسکتی جس کا عکس اگر پہاڑوں پر بھی پڑجائے تو وہ بھی جلال الٰہی کی تاب نہ لاکر

ریزہ ریزہ، چور چور، پاش پاش ہو جائیں۔ اس لیے قدرت الٰہی اس امانت کبریٰ کے لیے کسی خاص موقع کی منتظر تھی۔ لیکن اب اس کا انتظار ختم ہو چکا تھا یعنی انسانی ادراک واحساس اپنی معراج کمال تک پہونچ چکا تھا۔ لہٰذا اسے اس کی وہ "امانت کبریٰ" اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ سپرد کردی گئی۔ پس تاریخ شریعت کے اس آخری اور عظیم الشان انقلاب کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی نہ ہوگا کہ ارض الٰہی کی خلافت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر بنی اسمٰعیل میں چلی آئی کیونکہ دونوں کی ذمہ داریوں میں بعد المشرقین ہے۔ ناصرہ کا داعی حق صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو راہ راست پر لانے آیا تھا۔ لیکن عرب کا امی فداہ ابی وامی سارے عالم کو سچائی کا درس دینے اور کھو جانے والی پوری دنیا کو ہدایت کا سبق پڑھانے آیا۔ سو اسی مناسبت سے امت مسیحی اور امت محمدی کی ذمہ داریوں اور ان کے خصائص میں بھی تفریق کرنی پڑے گی۔ گو بنی اسرائیل کے انتخاب اور استخلاف کی غرض وغایت بھی حکومت خداوندی کا قیام اور احقاق حق والطال باطل ہی تھا لیکن اس کا دائرۂ عمل محض شام کے اطراف ہی تک محدود تھا۔ بخلاف اس کے امت مرحومہ کا مشن بھی اگرچہ وہی تھا لیکن اس کے لیے زمین کے کسی ایک گوشہ یا رنگ ونسل کے کسی خاص گروہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ انکا پیغمبر خاتم الانبیاء تھا، ان کی شریعت اکمل الشرائع اور ان کی امت خیر الامم تھی۔ ان کے ہاتھ میں پورے کرۂ ارض کی زمام خلافت دی گئی اور مشرق ومغرب کے ہر گوشہ سے بدی کا استیصال کرنا اور اس کی جگہ نیکی کی تخم ریزی کرنا اس کا واحد مقصد اور واحد نصب العین قرار دیا گیا۔

غرض جس خلافت کی تاسیس عالم روحانیت میں اتنے قیل وقال کے بعد کی گئی تھی وہ ترمیم وتنسیخ کے ہزارہا دور گذرنے کے بعد اپنے اُس مرکز کمال تک پہونچ گئی جہاں سے نہ آگے بڑھنے کی گنجائش تھی نہ پیچھے ہٹنے کی یعنی فطرۃ نے اپنے چہرہ سے یکسر نقاب الٹ دی کیونکہ عقل اپنے مرکز ارتقا پر پہنچکر اس کی جوہر شناس اور راز دار بننے کے قابل ہو چکی تھی اور عدل وقسط جو اس کا جوہر اور

قوام ہے بغیر کسی آمیزش اور بغیر کسی خارجی تاثر اور انفعال کے پورے جمال کے ساتھ دنیا کے سامنے چمک اٹھا تھا۔ پس وہ جماعت جس نے اس میزان عدل و قسط کو اپنے ہاتھوں میں لیا، فطرۃً امت وسط بن گئی اور یہی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے کیونکہ شرائع سابقہ مخاطبین کے حالات۔ خارجی اور خصوصیات ذہنی و باطنی کا اعتبار کرتے ہوئے فطرۃ کے جادے سے ذرا منحرف ہوا کرتی تھیں۔ یہود کا ظاہر و باطن چاہتا تھا کہ ان کی شریعت تیغ دو دم ہو۔ لیکن مخاطبین مسیح کے حالات کا تقاضا تھا کہ فروتنی و خاکساری ان کا سرمایہ کمال قرار دی جائے۔ اسی بنا پر آپ اگر غور کریں گے تو پائیں گے کہ ایک میں انتہائی شدت و غلظت ہے اور دوسری سراپا لینت، لیکن رسول عربی کی شریعت اس افراط و تفریط سے بالکل بے داغ اور سراپا عدل و قسط بنکر آئی کیونکہ کوئی شریعت فطرۃ سے سرمو تجاوز کر کے عالمگیر اور ابدی شریعت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام دین فطرت کہلایا اور امت مسلمہ کو امت وسط کہکر پکارا گیا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۔ (بقرہ ۱۷)

چنانچہ ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا کہ تم لوگوں کے لیے (حق کے) گواہ ہو۔

اس آیت کریمہ میں امۃ وسطاً اور شہداء علی الناس اسی حقیقت کی تشریح ہے جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یہ ہے خیر الامم کا مشن اور اس قدر عظیم ہیں اس کی ذمہ داریاں۔

عربوں کو خلافت کیوں ملی بنی اسرائیل کی معزولی اور خیر الامم کی تجویز بعثت کے وقت قدرت کی نگاہیں ہر چہار جانب اٹھیں لیکن جس حسن فطرۃ کی اسے تلاش تھی اس سے ہر ناصیۂ کمال بے نور نظر آیا۔ آخر کار یہ متجسس نگاہیں وحشت کدۂ عرب میں پہنچکر ٹھٹک گئیں اور غور سے دیکھنے کے بعد انہوں نے معلوم کر لیا کہ اگرچہ بظاہر یہ زمین جہل و بربریت کا ہیبت ناک سنگلاخ ہے لیکن اس کی تہ میں وہ خالص جوہر اور صالح مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے جو اس تخم کی روئیدگی و بالیدگی کا پوری طرح متکفل ہو سکتا ہے

جس کی تخم ریزی آج قدرت کرنا چاہتی ہے اور جس کی شاخوں کے سایہ کو ہر عربی و عجمی کے سر پر پہنچنا ہے یہ قدرت کا انتخاب تھا جس پر وہ نازاں بھی کیونکہ اسے عواقب کی خبر تھی۔ دنیا فرط حیرت سے اس کا مضحکہ اڑانے لگی آوازے کسنے لگی کیونکہ اس کی ناسوتی نگاہیں اس رمز تک نہ پہنچ سکی تھیں لیکن گنتی کے دن بھی گذرنے پائے تھے کہ غیب کے حجابات ایک ایک کرکے ہٹنے لگے اور جو چیز دنیا کے نزدیک ناممکن الوقوع تھی آنکھوں نے سورج کی روشنی میں اسے موجود ہوتے دیکھا۔

عرب نے دنیا کی سیاست، مذہب، تمدن، طرز معاشرت، پر ذہنی و فکری حیثیت سے جو اثر ڈالا وہ اس قدر عیاں ہے کہ اسے عیاں کرنے کی ضرورت نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اتنا بڑا عظیم الشان انقلاب اس سرزمین سے کیوں اٹھا؟ یہ مرکز شر و فساد مہبط سعادت کیونکر بن گیا؟ ان بدوؤں کے ہاتھوں سے اونٹوں کی مہار لیکر مشرق و مغرب کی زمام سیادت کس نے دی؟ کیا قدرت کو وہاں کی سرزمین سے کوئی خاص انس تھا؟ کیا یہاں کے باشندے اس کے لاڈلے تھے کہ بغیر کسی استحقاق کے انھیں فرمانروائی عالم کے تخت پر لے جاکر بٹھادیا؟ عقل سلیم تو اسے ایک لمحہ کے لیے بھی باور کرنے کو تیار نہیں، یہ عالم اسباب ہے جو دینے والے کی راہ میں سب کچھ کھو دیتا ہے وہ سب کچھ پالیتا ہے، جو سر جھکاتا ہے وہی سربلند ہوتا ہے۔ جو گردن کشاتا ہے وہی حیات پاتا ہے، یعنی وہی سنت الہیہ یہاں بھی کارفرما تھی جس نے بنی اسرائیل کو بے تاج و تخت کیا تھا، اس کا قانون اب بھی ویسا ہی بے لچک تھا جیسے پہلوں کے لیے تھا۔

اسلام کی ابتدائی زندگی پر غور کیجیے، مظلومیت کی کیسی بے نظیر تاریخ ہے یہیں سے قدرت کی حکمت بھی دیکھتے چلیے اور ساتھ ہی اس کا عدل بھی۔ خلافت اسرائیلی اور خلافت عربی دونوں کی تاریخ سامنے رکھیے۔ سنۃ اللہ کا حسن اور زیادہ بے نقاب دکھائی دے گا۔ اس کا قانون یہ ہے کہ بندہ کو ابتلا و آزمائش میں ڈالکر پہلے پرکھ لیا جائے گا پھر حسب لیاقت نعمتوں سے سرفراز کیا جائے گا۔ چنانچہ

مسلمانوں کی بے قراری اور بے تابی کے وقت لسانِ حبیب اس انداز سے بے نیازی کے ساتھ تنبیہ کرتی ہے۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ (روم ۲)
کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ محض اُن کے یہ کہدینے سے کہ ہم ایمان لائے انھیں چھوڑ دیا جائیگا اور انہیں پرکھا نہ جائے گا۔

غور فرمائیے یہود کی سیادت محدود تھی اور شریعت بھی محدود، بایں وجہ ان کی آزمائشوں کی کمیت اور کیفیت بھی محدود رہی کیونکہ جس سونے کو جتنا کھرا بنانا ہوتا ہے۔ اسی قدر اسے تپایا جاتا ہے۔ امت محمدیہ پر نعم الٰہیہ کا اتمام ہونے والا تھا اس کو وہ خلعت سیادت عطا کیا جانے والا تھا جسے دنیا اپنی کہنہ سالی کے باوجود ابتک نہ دیکھ سکی تھی۔ لھذا ضروری تھا کہ فتنوں اور آزمائشوں کا ویسا ہی مہیب سیلاب بھی آتا جسے چشم تصور ابتک نہ دیکھ سکی ہو۔ یہ سیلاب آیا یا نہیں؟ اور اس کے تھپیڑوں میں کوئی انسانی فرد یا گروہ ثابت قدم بھی رہا یا نہیں؟ یہ سوالات وہ ہیں جن کے جوابات تمام دنیا نے ایک ہی دیے ہیں۔ اس کا ثبوت بحث و تمحیص سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ تاریخ اسلام کے ابتدائی اوراق مظلومیت کا ایک عدیم المثال مرقع ہیں۔ بنی اسرائیل کے پورے خانوادہ کے لیے ایک فرعون تھا۔ لیکن یہاں ہر لا الٰہ اِلَّا اللّٰہُ محمد رسول اللّٰہ کہنے والے کے لیے ایک فرعون موجود ہے۔ وہاں ایک فتنہ ہے جسے غرق کرنے کے لیے سمندر کو آنا پڑتا ہے۔ لیکن یہاں انگاروں میں جلائے جا رہے ہیں، چٹانوں سے پیسے جا رہے ہیں، تپتی ہوئی ریت پر لٹائے جا رہے ہیں، سالہا سال تک آب و دانہ پہنچنے کی راہیں مسدود کی جا رہی ہیں۔ لیکن قدرت کی بے نیازی! نہ تو آگ ہی کو الہام ہوتا ہے کہ بردًا و سلامًا بن جائے۔ نہ چٹانوں سے کہا جاتا ہے کہ اپنا وزن روک لیں۔ نہ ریت کی تپش جھلسانے سے باز آتی ہے، نہ آسمان سے من و سلویٰ کا نزول ہوتا ہے، ان تمام باتوں

کے بعد بھی کلمہ گوئی کی تعزیریں ختم نہیں ہوتیں۔ حکم ہوتا ہے گھر چھوڑ دو، مال و جائداد سے دست کش ہو جاؤ، بیوی بچوں کو الوداع کہو، حدودِ وطن سے باہر نکل جاؤ۔ بالآخر کرنے والے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ لیکن جس زمین پر بھی جاتے ہیں وہ آسمان سے خالی نہیں نکلتی۔ سب کچھ تیاگ دینے کے بعد حکم ہوتا ہے کہ اب اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھکر آؤ کہ خلافت کے فرائض اب جا کر شروع ہو رہے ہیں۔ ان سے محاربہ کرو جو خدا سے محاربہ کرتے ہیں۔ ان کو قتل کرو جو تم سے مقابلہ کرتے ہیں۔ حکومت الٰہی کے باغیوں کا قلع قمع کرو خواہ وہ تمہارے بازو کی قوت ہوں یا جگر کے ٹکڑے۔ اگر تم ایک ہو تو ان کے دس سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ آخرکار بڑھنے والے بڑھے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ جاؤ تم اور تمہارے خدا لڑیں۔ انھیں یہ ڈر نہ تھا کہ "قوم جبار" سے مڈبھیڑ کا حکم ہو رہا ہے۔ انھیں غم تو اس کا ہوتا تھا کہ ہم مشہد میں جانے سے کیوں رہے جاتے ہیں۔ اور یہی مقام ہے جہاں انسان جنت ارضی (خلافت) و جنت سماوی کا وارث بنتا ہے۔ اس ٹکڑے سودے کی تشریح خدا نے یوں کی ہے۔

ان اللہ اشتریٰ من المومنین اَنفُسَھُم واموالھم بِاَنَّ لَھُمُ الجَنَّۃَ۔ — خدا نے مومنین سے ان کی جان و مال کو جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔

اس قدر اطاعت الٰہی میں ڈوب جانے اور اس قدر فدا کار بن جانے کے باوجود مربی غیب ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ چوک پر بھی اپنی تعزیری کارروائیوں سے باز نہ آتا۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایک اجتہادی غلطی کا ارتکاب کیا تو خدائے قہار کی ایسی ڈانٹ پڑی کہ کلیجے دہل گئے۔ غزوۂ احد میں میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا لیکن دفعتاً قدرت نے جنگ کا پانسہ بایں وجہ بدل دیا کہ عقب کے تیراندازوں نے قبل از وقت اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اور غنائم پر جھک پڑے۔ غزوۂ حنین میں اسلامی لشکر اپنی جراری کے

باوجود شکست کھا گیا صرف اس بنا پر کہ اس کے جذبۂ توکل علی اللہ کے کمال میں نقص آگیا تھا اور اپنی کثرت پر کسی قدر ناز تھا۔

قرآن کریم کے اکثر و بیشتر احکامات ایسے ہی مواقع پر نازل ہوئے ہیں جب ادھر سے کسی قسم کی چوک ہوئی ہے۔ اس طرح اس نے حکیمانہ اصول تربیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مومنین کی تطہیر کی اور جب ایک صالح جماعت اللہ والوں کی پیدا ہوگئی جو اللہ کے ہاتھ سے پکڑتے، اللہ ہی کے پیر سے چلتے اور اللہ ہی کی آنکھ سے دیکھتے، جن کا ایمان فتنوں کی بھٹی میں جلکر خالص کندن کی طرح چمکنے لگا تھا، جن کے متعلق خدا نے یہ اقرار کیا کہ میں ان سے راضی ہوا اور وہ مجھ سے راضی ہوئے، جن کی مختصر لیکن جامع تعریف یہ تھی کہ کفار کے لیے سخت ہیں، اپنے لوگوں (مومنین) کے لیے نرم رکوع و سجود میں مشغول، رضوان الٰہی کی تلاش میں محو ہیں، غرض قدرت نے جب ہر طرح سے انھیں پرکھ لیا کہ صالحین اور متقین کا گروہ اپنے باطن کا تزکیہ پوری طرح کرچکا ہے اور اب اس قابل ہے کہ ساری دنیا کی تطہیر اور تزکیہ کا بیڑا اٹھائے اس وقت وَلَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً کا خداوندی وعدہ پورا ہوا، کیونکہ ہر نہج سے وہ اس کے مستحق ہوچکے تھے، اور قدرت کو کامل یقین ہو چکا تھا کہ اگر ان کو زمین میں تمکن عطا کیا جائے گا تو یہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے نیکی کا پرچار کریں گے اور برائی کا استیصال کریں گے اور یہی خلاصہ ہے منشا خلافت کا۔

مسلمانوں کی معزولی اوپر کی سطروں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عالم اسباب کے اندر عزل و نصب کا سررشتہ اسی سنت الٰہیہ کے دامن سے بندھا ہوا ہے جو سب کے ساتھ یکساں رہی ہے۔ صدر اول کے مسلمانوں کو خلافت کا تاج بخشا گیا کیونکہ وہ ہر شرط پر پورے اتر چکے تھے۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ آخری شریعت آجانے کے بعد فطرۃ الٰہی مردہ ہوچکی ہے، یا قدرت اپنے آخری فیصلہ کو نافذ کرکے سو رہی ہے۔ اس نے اس وقت بھی وہی الفاظ دہرائے تھے جو بنی اسرائیل کو سریر خلافت پر بٹھاتے

وقت کیسے تھے کہ :۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۔ (یونس) پھر ہم نے ان کے بعد زمین پر تم کو خلیفہ بنایا، تاکہ دیکھیں تم کس طرح کام کرتے ہو۔

جس قدر زمانہ گذرتا گیا کیف تعملون کی حقیقت واضح ہوتی گئی۔ ان دو لفظوں میں امت مسلمہ کی پوری تاریخ بیان کر دی گئی ہے۔ ان کے اندر اسلامی عروج و زوال کی پوری تفصیل موجود ہے تصویر خیر الامم کا ایک رخ تو وہ ہے جسے پچھلے لفظوں میں دکھایا جا چکا ہے، اور دوسرا رخ یہ ہے جو آج ہماری اور آپ کی نگاہوں کو بے حجاب نظر آ رہا ہے۔ مسلمانوں کی اس معزولی و محکومی اور ان کی پستی و درماندگی پر نظر ڈالتے ہی مجھے صادق و مصدوق کی وہ المناک پیشین گوئی یاد آ گئی جس کی حقانیت پر تاریخ اسلام کا ہر آنے والا لمحہ مہر تصدیق ثبت کرتا جاتا ہے کہ :۔

لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حذو النعل بالنعل حتى لو دخلوا جحر ضب لدخلتموه قالوا اليهود والنصارى؟ قال فمن ۔ (بخاری) یقین ہے کہ تم بھی ان سب راستوں پر چلو گے جن پر پچھلی امتیں چل چکی ہیں۔ تم قدم بقدم ان کی پیروی کرو گے حتی کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسی ہیں تو تم بھی اس میں ضرور گھسو گے۔ لوگوں نے پوچھا کیا پچھلی امتوں سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ فرمایا اور کون؟ (باقی)

سراپائے رسول

اس مختصر کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک اور آپ کے عادات و خصائل لباس، معاشرت، اخلاق، آداب و اطوار اور عام طرز معاشرت کے متعلق تمام معلومات نہایت سہل زبان میں لکھی گئی ہیں۔ جیبی تقطیع پر خوبصورت لیتھو کیگئی ہے۔ قیمت: ... دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے۔

تنزیل و تاویل

تفسیر آیۂ مَاکَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی

(از جناب مولٰنا داؤد اکبر صاحب اصلاحی)

ایک استفسار کے جواب میں آیات مَاکَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ لَوْلَا کِتٰبٌ مِّنَ اللّٰہِ سَبَقَ لَمَسَّکُمْ فِیْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ کی جو تاویل ہم نے رسالہ ترجمان القرآن (بابتہ شوال ۱۳۵۵ھ) میں اختیار کی تھی مولانا ابوالاعلیٰ صاحب کو اس سے اتفاق نہیں چنانچہ مولٰنا نے آخر میں اپنی تحقیق بھی درج فرما دی ہے، ہم نے مولٰنا کی تحقیق کو بار بار پڑھا، اور ہر مرتبہ اسی نتیجہ پر پہنچے کہ مولٰنا کے سامنے ہماری تاویل کے قبول کرنے میں اصلی وقت خطاب کی ہے اس لیے آج ہم قرآن پاک کے طریقہ خطاب سے بحث کریں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو مولٰنا نے ابن عباس اور دیگر مفسرین کی جو تصریح پیش کی ہے اس سے بھی بحث کریں گے۔

مجھے اپنی تاویل پر اصرار نہیں ہے اس لیے اس پر جو کچھ بھی لکھوں گا طالبعلمانہ لکھوں گا اور مقصود تحقیق مسئلہ ہوگا نہ کہ بحث و مناظرہ اس لیے کہ مناظرہ سے آج تک کوئی مسئلہ طے نہیں ہوا ہے۔ مولانا نے خطاب کی حسب ذیل زحمتوں کو پیش کرکے میری تاویل کی تردید فرمائی ہے:-

(۱) سورۂ انفال کے ساتویں رکوع سے اخیر سورہ تک خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، یا مسلمانوں سے ہوا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ تریدون، لمسکم اور فیما اخذتم کا خطاب بھی مسلمانوں سے ہی ہو۔

(۲) بالفرض اگر تریدون وغیرہ کا مخاطب کفار یا یہودیوں کو قرار دے دیا جائے تو پھر فکلوا مما غنمتم کا خطاب کس سے ہوگا؟ ایک ہی سلسلۂ کلام میں کہیں مسلمانوں سے خطاب اور کہیں یہود و کفار سے خطاب کلام کو بے معنی کر دیتا ہے۔

(۳) مابعد کی آیت کے اس ٹکڑے (مما اخذ منکم) سے معلوم ہوتا ہے کہ فیما آخذتم کا خطاب بھی مسلمانوں ہی سے ہوگا۔

ہمارے نزدیک مولانا جن وجوہ کی بنا پر تریدون، لمسکم، فیما اخذ تم کا خطاب مسلمانوں کی طرف لینے پر مصر ہیں وہ وجوہ قطعاً اس مقام پر موجود نہیں ہیں۔ سب سے بڑی زحمت ہماری تاویل کے لینے میں مولانا محترم کے سامنے یہ ہے کہ آیا اس طرح تبدیلی خطاب اور دخل مقدر ہوتا بھی ہے؟ یوں ہی جہاں چاہا خطاب میں تبدیلی اور دخل مقدر ٹھیرا لیا۔ ہماری دانست میں ہماری تاویل کے لحاظ سے جو تبدیلی خطاب اور دخل مقدر ماننا پڑتا ہے نہ تو یہ دخل مقدر ہی کی کوئی انوکھی مثال ہے اور نہ تبدیلی خطاب ہی کی۔ بلکہ اس طرح کے تبدیل خطاب اور دخل مقدر کی بیسیوں مثالیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ چند آیات اپنے دعوے کے اثبات کے لیے نقل کرتا ہوں۔

"امثلہ تبدیل خطاب"

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:۔

انظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض و للاخرۃ اکبر درجات و اکبر تفضیلا لا تجعل مع اللہ الٰھا اخر فتقعد مذموما مخذولا و قضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ و بالوالدین احسانا اما یبلغن	دیکھ ہم نے کیونکر دنیا میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے حالانکہ آخرت ہی حقیقی شرافت و بزرگی کا معیار ہے خدا کے ساتھ کسی اور کو اس کا سہیم نہ ٹھیرا ورنہ تم برے ٹھیرو گے اور تیرے رب کا حکم ہے کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجنا اور ماں باپ کے ساتھ

عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا
تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا
قَوْلًا كَرِيْمًا.... وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا
كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ
نُفُوْسِكُمْ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ
لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى
حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ
تَبْذِيْرًا۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ
الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا
وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ
رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا
وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا
تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا
اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ
اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا
اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ
وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا
وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ

نیکی کرنا اگر ان میں ایک یا دونوں تیرے سامنے
بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کی بات میں اف تک کرنا
اور ان کے سامنے نرم دلی سے اطاعت کا
بازو جھکا دینا اور ان کے حق میں یہ دعا مانگنا کہ
پروردگار میرے والدین پر اسی طرح رحم فرمائیں جس طرح
انھوں نے جب میں چھوٹا تھا رحم کیا تھا تمہارا رب
تمہارے دلوں کے رازسے خوب واقف ہے اگر
تم نیک ہو تو وہ توبہ کرنے والوں پر بخشش کرتا ہے؛
اور قرابت دار کو اس کا حق ادا کر اور غریب اور
مسافر کا حق دے اور فضول خرچی نہ کیا کر، فضول
خرچ شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے آقا کا
بڑا ہی ناشکر گذار ہے اگر اپنے پروردگار کے فضل
کے انتظار میں جس کی تجھکو امید ہو ان مستحقین میں سے
کسی سے تجھکو منہ موڑنا پڑے تو ان کو نرمی سے سمجھا
دے، اور اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑ لے کہ گویا گردن میں
بندھا ہے اور نہ اتنا پھیلا ہی دے کہ ہر طرف سے تجھکو
لوگ ملامت کریں اور تو تہی دست ہو جائے تیرا رب
جس کی روزی چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے جس کی چاہتا
ہے کم کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے خوب

سَاءَ سَبِيلًا وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ
اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا
فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ
فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا وَلَا تَقْرَبُوا
مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ
أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ
كَانَ مَسْئُولًا وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ
وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَٰلِكَ
خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ
لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ
الْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا
وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ
تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ
طُولًا كُلُّ ذَٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ
مَكْرُوهًا ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ
رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ الآیۃ (رکوع ۲-۳-۴)

واقف ہے اور تم افلاس کے ڈر سے اپنے بچوں کو قتل
نہ کرو ہم ہی ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے
ہیں ان کا قتل کرنا بڑا ہی جرم ہے اور زنا کے پاس بھی
نہ جانا کہ وہ بےحیائی ہے اور بری راہ ہے اور جس جان کا
مارنا اللہ نے حرام کیا ہے اس کو ناحق قتل نہ کرو اور
جو شخص ظلم سے مارا جائے تو اس کے ولی وارث کو
قصاص کا حق ہم نے دیا ہے تو چاہیئے کہ وہ اس
خون میں زیادتی نہ کرے کیونکہ اس میں اس کو جیت
ہے اور یتیم جب تک اپنی عقل وشعور اور جوانی کو پہنچ
لے اس کے مال و جائداد کے قریب بھی نہ جانا لیکن
اس طریقے سے جا سکتے ہو جو ان کے حق میں بہتر ہو عہد کو
پورا کیا کرو اس کی باز پرس ہوگی اور جب ناپ کرو
تو پورا ناپ کردو اور جب تول کر دو تو سیدھی ترازو
سے تول کردو یہ طریقہ اچھا ہے اور اس کا انجام بھی
بہتر ہے اور جس بات کا تجھکو علم نہ ہو اس کے پیچھے
نہ ہوئے کیونکہ کان، آنکھ، دل سب سے مواخذہ
ہوگا اور زمین میں اکڑ کر نہ چل کہ تو اس چال سے نہ زمین کو شق کر ڈالے گا اور نہ پہاڑوں کے برابر
اونچا ہو جائے گا۔ ان تمام باتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ تمام احکام
دانشمندی کی ان باتوں میں سے ہیں جو خدا نے تیری طرف وحی کی ہے''۔

اوپر آیات کا جو سلسلہ ہم نے نقل کیا ہے اس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں خطاب کی گونا گون تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ کہیں پیغمبر سے خطاب ہے تو کہیں عام لوگوں سے۔ اِن آیات میں ذرا امعان نظر سے کام لیں گے تو خطاب سے متعلق ایک زبردست اصول ہاتھ آئے گا۔ وہ یہ کہ بعض اوقات قرآن مجید ایک بات عام لوگوں سے بواسطۂ نبی بحیثیت اس کے کہتا ہے کہ وہ سب کا امام و قائد ہے۔ اس صورت میں ایک ہی سلسلۂ کلام میں تبدیلی خطاب کا ہونا لازم ہے۔

پھر سورۂ احزاب کی ابتدائی آیات بغور پڑھیے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا وَاتَّبِعْ ... مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا۔

اے نبی! تقویٰ اختیار کرو اور کافروں اور منافقوں کی باتوں پر کان نہ دھرو اللہ (سب کے احوال سے) واقف ہے اور حکمت والا ہے اور جو کچھ تمہارے پروردگار کی جانب سے وحی کی جاتی ہے اس کی پیروی کرو بیشک خدا تمہارے اعمال سے اچھی طرح واقف ہے۔

ایک دوسری جگہ یوں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ۔ (الطلاق: ۱)

اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا شمار کرو اور اللہ سے جو تمہارا پروردگار ہے ڈرتے رہو تم انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود ہی نکل جائیں

سورۂ ہود میں ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ وَلَا

پس تم اور جو لوگ توبہ کر کے تمہارے ساتھ ہوگئے ہیں (دین پر) قائم رہو اور حد اعتدال سے نہ بڑھو۔

تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُونَ - (رکوع ۱۰)	خدا کی آنکھیں تمہارے اعمال کا اچھی طرح مشاہدہ کر رہی ہیں اور ان لوگوں کی طرف جنہوں نے ظلم کیا ہے نہ جھکنا کہ آگ تم کو آ لگے حال یہ ہے کہ خدا کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں پھر تم بے یار و مددگار کے ہو گے ۔

دیکھیے ان سب آیات میں خطاب کی ابتدا نبیؐ سے کی گئی ہے لیکن مراد پوری امت ہے اسی لیے بعد میں خطاب جمع کے صیغہ سے لایا گیا ہے ۔ اس قسم کی بے شمار آیات قرآن پاک میں ہیں لیکن خوف طوالت کی بنا پر چند ہی پر ہم نے اکتفا کیا ہے ۔

سورہ نحل میں ہے ۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (رکوع ۶)	اے نبیؐ ہم نے تم سے پہلے تمہاری ہی طرح کے آدمی پیغمبر بنا کر بھیجے تھے دلائل اور صحائف کے ساتھ ان کی طرف وحی بھیجتے تھے تو اگر تمہیں نہیں معلوم تو اہل کتاب سے پوچھ لو اور اسی طرح تم پر بھی یہ قرآن ہم نے نازل کیا ہے تاکہ جو پیام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے اس کی شرح کر دو ۔ اور تاکہ وہ بھی سوچیں ۔

یہ آیات ایک ہی سلسلہ کلام کی ہیں لیکن ملاحظہ ہو ان میں خطاب کی کیسی تبدیلی ہوئی ہے ۔ پہلے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب (من قبلک) التفات ہے ۔ پھر عام لوگوں کی طرف (فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون) ہے اس کے بعد پھر آپ ہی کی جانب (وانزلنا الیک الذکر لتبین) التفات ہے ۔

خطاب سے متعلق اب تک جو کچھ کہا گیا، اس سے محض یہ دکھلانا مقصود ہے کہ ایک ہی سلسلہ کلام میں

تبدیل خطاب ہوتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ تبدیلی کلام کے حسن پر کچھ بھی اثر انداز نہیں ہوا کرتی بلکہ اس سے کلام کا حسن اور دوبالا ہوجاتا ہے۔ اس مقام پر تبدیلی خطاب کے فوائد بیان کرنے کی گنجائش نہیں اس لیے ہم اسے نظر انداز کرکے اپنے اس دعوے کے اثبات میں دلائل لائیں گے کہ قرآن پاک میں بے شمار آیات دفع مقدر کے جواب میں واقع ہیں۔ اور نہ معلوم کتنی آیات میں ایسے شبہات واوہام رفع کیے گئے ہیں جو قرآن میں مذکور تک نہیں ہیں پہلے ہم وہ آیات نقل کرتے ہیں جن میں لوگوں کے ایسے اوہام باطلہ کا رد کیا گیا ہے جن کا قرآن میں تذکرہ تک نہیں ہے۔

سورۂ اعراف میں ہے۔

(۱) وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسٰى مِنْ بَعْدِهٖ
مِنْ حُلِيِّهِمْ جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ اَلَمْ يَرَوْا
لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا اِتَّخَذُوْهُ
وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْ اَيْدِيْهِمْ
وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا قَالُوْا لَئِنْ
لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰى اِلٰى قَوْمِهٖ
غَضْبَانَ اَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ
مِنْ بَعْدِيْ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ وَاَلْقَى
الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗ
اِلَيْهِ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ
وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ

اور موسیٰ کے پیچھے ان کی قوم کے لوگوں نے اپنے زیور کا ایک بچھڑا بنا کھڑا کیا کہ وہ ایک جسم تھا جس میں بیل کی سی، آواز تھی اتنا بھی نہ سوچا کہ وہ ان سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا، اور نہ ان کو راستہ ہی دکھا سکتا ہے اس کی پرستش میں لگ گئے حالانکہ وہ اپنے اوپر ظلم ڈھا رہے تھے اور جب ان کا کیا ان کے سامنے آیا اور اپنے کو انہوں نے بھٹکا ہوا پایا تو کہنے لگے اگر ہمارا پروردگار ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہمارے قصور نہ معاف کرے گا تو ہم یقیناً خاسرین میں سے ثابت ہوں گے اور جب موسیٰ غصہ اور رنج میں بھرا ہوا اپنی قوم کے پاس لوٹ کر آیا تو بولے میرے پیچھے میری غیبت میں تم نے بہت بری حرکت کی،

وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۔ کیا تم اپنے پروردگار کے حکم کے منتظر نہ رہکر جلدی کر (رکوع ۱۸) بیٹھے؟ اور الواح مقدس کو ڈالدیا اور اپنے بھائی کے سر کو پکڑ کر ان کو اپنی طرف کھینچنے لگا اس پر ہارون نے کہا ماں جائے بھائی لوگوں نے مجھکو بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ مجھکو ہلاک کر ڈالیں تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دے، اور مجھکو ظالم لوگوں کے ساتھ مت سان۔"

مذکورہ بالا آیات میں بیان واقعہ کے ساتھ ساتھ خط کشیدہ الفاظ سے یہودیوں کے اس زعم باطل کی تردید مقصود ہے جو انہوں نے حضرت ہارون کی جانب منسوب کر دیا چنانچہ تورات میں ہے

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑی پر سے اترنے میں دیری کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اس سے کہا کہ اٹھ ہمارے لیے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلیں کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا ہارون نے انھیں کہا کہ زیورسونے کے جو تمہاری جوروؤں اور تمہاری بیٹیوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کے ہارون کے پاس لائیں اور اس نے ان کے ہاتھوں سے لیا اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکی کے ہتیار سے درست کی اور انہوں نے کہا اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا اور جب ہارون نے یہ دیکھا تو اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور ہارون نے یہ کہہ کے منادی کی کہ کل خداوند کے لیے عید ہے۔ (خروج باب ۳۲)۔

دیکھیے توراۃ کی مذکورہ بالا آیات کے خط کشیدہ الفاظ میں یہودیوں کی جس حماقت کا قرآن پاک نے جواب دیا ہے اس کا تذکرہ تک قرآن میں نہیں ہے، لیکن حضرت ہارون کی طرف نسبت شرک کا بڑی خوبی کے ساتھ رد کر دیا ہے۔

سورۂ تحریم میں ہے۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا الآیۃ (رکوع)

اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی عصمت محفوظ رکھی۔

اس آیت میں احصنت فرجہا کی قید لگا کر قرآن پاک نے حضرت مریم کی عصمت و عفت کی طرف اشارہ کر دیا اور اہل کتاب نے ان کی جانب جو کذب و افترا منسوب کیا تھا اس کے تمام پردوں کو چاک کر کے اصل حقیقت ظاہر کر دی۔ اس باب میں انہوں نے جو جعلسازیاں کی ہیں اُن کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے انجیل کا پہلا باب پڑھنا چاہیے۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَى (رکوع)

اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنے بدن میں رکھ لو تو بدُن اس کے کہ کسی طرح کا روگ ہو سفید نکلے گا۔ دوسرا معجزہ

اس آیت میں خط کشیدہ الفاظ سے یہودیوں کے ایک وہم کی تردید مقصود ہے، توراۃ میں ہے

"پھر خداوند نے اسے کہا کہ تو اپنا ہاتھ اپنی چھاتی پر چھپا کے رکھ چنانچہ اس نے اپنا ہاتھ اپنی چھاتی پر چھپا کے رکھا اور جب اس نے اسے نکالا تو دیکھا کہ اس کا ہاتھ برف کی مانند سفید مبروص تھا" (خروج باب ۴)

سورۂ ق میں ہے۔

(۴) وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ (رکوع ۳)

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ اس کے درمیان ہے چھ دن میں پیدا کیا اور ہمیں تکان چھو تک نہیں گئی۔

اس آیت میں بھی خط کشیدہ الفاظ سے خدا نے یہودیوں کے ایک زعم باطل کی تردید کی ہے

وہ یہ کہ یہودیوں کا خیال تھا کہ خدا کو آسمان و زمین کی تخلیق سے تکان لاحق ہوگئی تھی چنانچہ ساتویں دن اس نے آرام کیا۔ تفصیل معلوم کرنے کے لیے توراۃ کی کتاب پیدائش کے باب دوم کی طرف مراجعت کرنی چاہیے۔

اب تک ہم نے اپنے اس دعوے کے اثبات میں (کہ قرآن پاک میں بے شمار آیات دخل مقدر کے جواب میں واقع ہیں) ایسی آیات نقل کی ہیں جن میں قرآن پاک نے بحیثیت کتب سابقہ کے مہیمن ہونے کے ان کے شبہات و اوہام کا جواب دیا ہے اور جن کا تذکرہ تک قرآن میں نہیں ہے۔ اب ہم وہ آیات نقل کرتے ہیں جو ایسے دخل مقدر کے جواب میں واقع ہیں جو قرآن میں کہیں نہ کہیں مذکور بھی ہے۔

سورۂ لقمان میں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (رکوع ۴)

بیشک خدا کو قیامت کا علم ہے اور وہی پانی برساتا ہے اور اسے یہ بھی خبر ہے کہ رحموں میں کیا ہے حالانکہ (انسانوں میں سے) کسی کو اس کی خبر نہیں کہ کل کیا کمائے گا اور کسی کو یہ بھی علم نہیں کہ کونسی زمین میں مرے گا یقیناً علیم و خبیر ہے

مذکورۂ بالا آیت پر غور کریں گے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ آیت کسی نہ کسی دخل مقدر کے جواب میں واقع ہے۔ ہماری دانست میں اس کا دخل مقدر یہ سوال ہے اور یہ ایک ہی جگہ قرآن پاک میں نہیں مذکور ہے بلکہ متعدد جگہ ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (الانبیاء : ۳)

وہ کہتے ہیں اس وعدہ (قیامت) کا ایفا کب ہے اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

یہی آیت بار بار سورۂ یسین (رکوع ۴) سبا (رکوع ۳) نمل (۶) اور ملک (۲) میں دہرائی گئی ہے
یہ دخل مقدر جن جن صورتوں میں آیا ہے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی مناسب حال جواب دیا گیا ہے

لیکن اس کا جو جواب سورۂ لقمان میں مذکور ہے تقریباً وہی سورہ ملک میں بھی ہے۔

قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (رکوع ۲)

کہدے (اس کا) علم تو خدا ہی کو ہے اور میں تو صرف نذیر ہوں۔

الشوریٰ میں ہے۔

(۲) وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَاۤئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَاۤءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۔ (رکوع ۵)

اور کسی کو یہ مجاز نہیں کہ خدا اس سے مکالمہ کرے مگر یہ کہ یا تو وحی کے واسطے سے یا پردہ کی اوٹ سے یا یہ کہ (اس کے پاس) رسول (فرشتہ) بھیج کر پس وہ خدا کے اذن سے جو وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے ضرور وہ بہت ہی بلند اور حکمت والا ہے۔

مذکورۂ بالا آیت اس دخل مقدر کے جواب میں واقع ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ۔ الآیۃ (البقر:۱۴)

اور وہ لوگ جو نہیں جانتے کہتے ہیں کہ کیوں نہیں خدا ہم سے باتیں کرتا یا کیوں نہیں ہمارے پاس کوئی معجزہ آتا۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (رکوع ۸)

بے شک مسلمان یہودی نصاریٰ اور صابی میں سے جس نے یقین کیا خدا اور آخرت کا اور عمل صالح کیا ان کے لیے خدا کے یہاں اجر ہے اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ کسی طرح کا غم۔

مذکورۂ بالا آیت اہل کتاب کے زعم باطل کی تردید میں واقع ہے اور وہ یہ ہے:۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۔ (بقرہ ۱۳)

وہ کہتے ہیں نہیں داخل ہوگا جنت میں مگر وہ جو کہ یہودی ہو یا نصرانی یہ ان کے اوہام ہیں کہدے ذرا اپنے اس دعوے پر دلیل تو لادیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (الآیۃ) (المائدہ ۳:)

اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب نظر ہیں۔

سورۂ انعام میں ہے۔

(۴) وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ۔ (الانعام ۱:) ۔

اور اگر تم پر کوئی کاغذ پر لکھا ہوا صحیفہ اتارتے اور یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اسے چھو بھی لیتے تو یہ لوگ (کفار و معاندین) کہتے کہ یہ تو سحر ہے۔

مذکورہ بالا آیت کا یہ دخل مقدر ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۔ (الانعام ۴:)

اور وہ کہتے ہیں کیوں نہیں اس پر کوئی نشان اتارا جاتا کہدے خدا نشان اتارنے پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔

سورۂ طور میں ہے۔

(۵) وَإِنْ يَرَوْا كِسْفًا مِنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَرْكُومٌ ۔ (رکوع ۲)

اور اگر وہ آسمان سے کوئی بادل کا ٹکڑا گرتے ہوئے دیکھیں تو کہیں گے۔ یہ تو منجمد بادل ہے۔

مذکورہ بالا آیت اس دخل مقدر کے جواب میں واقع ہے۔

أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا (۹۲ بنی اسرائیل)

یا یہ کہ آسمان سے کوئی بادل کا ٹکڑا گرادو اگر تم اپنے دعوے (رسالت) میں سچے ہو۔

ہم نے دخل مقدر کے متعلق جتنی آیات نقل کی ہیں انھیں دو قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے ایک وہ جن کا دخل مقدر قرآن پاک میں سرے سے مذکور ہی نہیں بلکہ قرائن اور کتب سابقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور دوسرے وہ جن کا دخل مقدر قرآن میں مذکور ہے لیکن ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم نے اما کہ مذکورہ بالا آیات میں سے بعض تو ایسے اعتراض کے جواب میں واقع ہیں جو قرآن پاک میں مذکور تک نہیں اور بعض کے دخل مقدر مذکور ہیں لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوگیا کہ آیات "مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ـ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ" بھی دخل مقدر کے جواب میں واقع ہیں جب کہ بظاہر یہاں کوئی قرینہ نہیں ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ آیات مستفسر عنہا میں جو دخل مقدر ہم نے ٹھیرایا ہے اس کی تائید قرائن اور نظام سورہ سے بھی ہوتی ہے اس کے لیے زیر بحث آیات کی سورہ پر ان پہلوؤں سے غور کرنا چاہیے۔ (باقی)۔

التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح۔

تالیف جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مشکوٰۃ شریف علم حدیث کی مشہور مستند کتابوں میں سے ہے جسمیں صحاح ستہ اور دوسری معتبر کتب حدیث کا عطر نکال کر رکھدیا گیا ہے۔ فاضل مولف نے عربی زبان میں اس کی شرح لکھی ہے جس کے متعلق مولنا انور شاہ صاحب مرحوم و مغفور جیسے علامہ اجل کی شہادت ہے کہ اتبک اس کتاب کی اس سے بہتر شرح نہیں لکھی گئی۔ اس میں پچھلی تمام شرحوں کی خوبیاں جمع کردی گئی ہیں اور ان پر حسب ذیل خصوصیات کا اضافہ کیا گیا ہے: ۱۔ اسرار شریعت و حقائق و معارف اسلامیہ کے بیان کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ ۲۔ ہر باب کی ابتدا میں اس کے مفہوم کے لحاظ سے تمام آیات قرآنیہ جمع کردی گئی ہیں تاکہ حدیث اور قرآن کے درمیان تطابق واضح ہوجائے ۳۔ صحابہ و تابعین کے مذاہب مفصل بیان کیے گئے ہیں اور اختلافی مسائل میں ائمہ اربعہ کے مذاہب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب فاضل مولف نے خود دمشق جا کر چھپوائی ہے۔ کاغذ اور طباعت بہترین ہے چار جلدیں طبع ہوچکی ہیں۔ دو جلدیں عنقریب طبع کرانے والے ہیں قیمت سے کلدار عہ جلد علاوہ محصولڈاک دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمایئے

مطبوعات

Muslim Thought And Its Source

تالیف جناب سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ قیمت لعہ۔ ملنے کا پتہ :۔ دی گریٹ ایسٹرن لائبریری ۱۵۱ کالج اسکوئیر۔ کلکتہ۔

یہ کتاب مغربی مصنفین کے اس دعوے کی تردید میں لکھی گئی ہے کہ مسلمانوں میں فکری نشو و نما کی ابتدا یونانی عقلیات، کے مطالعہ سے ہوئی اور ان کے تمام معقولات اسی سرچشمے سے ماخوذ تھے۔ مؤلف نے اس ادعائے غلط کا ابطال کرنے کے لیے سب سے پہلے مجملاً یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کو غور و فکر اور تحقیق و تجسس پر ابھارنے والی چیز دراصل حکمت یونان نہیں بلکہ تعلیم قرآن تھی اور اس تعلیم کے اثر سے انہوں نے مسائل حکمت پر اس وقت سوچنا شروع کر دیا تھا جب یونانی علوم کے متعلق وہ کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس اجمال کے بعد مؤلف نے تفصیل کا طریق اختیار کیا ہے۔ ابتدائی فکری حرکت نے رفتہ رفتہ مسلمانوں میں جو راہیں اختیار کیں، ان میں سے وہ چار بڑی بڑی راہوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ اعتزال، اشعریت، تصوف اور حکمت یعنی فلسفہ و سائنس۔ پھر ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ بحث کرتے ہیں۔ پہلے تین مذاہب کے متعلق انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ان کی اصل یونانی نہیں بلکہ خالص اسلامی ہے۔ اگرچہ ان مذاہب کے متبعین نے آگے چل کر یونانی اور عجمی علوم سے استفادہ ضرور کیا، لیکن جن مسائل پر انہوں نے بحث کی وہ سب کے سب قرآن کے مطالعہ سے پیدا ہوئے تھے، اور ان کے استدلال کی بنا بھی قرآن ہی پر قائم تھی۔ رہی آخری چیز تو وہ بلاشبہ دوسری قوموں سے مسلمانوں میں آئی مگر مسلمان محض دوسروں کے مترجم اور شارح نہ تھے جیسا کہ مغربی مصنفین کا گمان ہے، بلکہ انہوں نے عقلیات اور طبیعیات کا جس قدر ورثہ دوسروں سے پایا اس

بہت زیادہ دوسروں کے لیے چھوڑا۔

یہ تمام مباحث جو اس کتاب میں بیان ہوئے ہیں اردو زبان میں اس سے پہلے بارہا آچکے ہیں مگر انگریزی میں شائد اب تک کسی نے ان کو اتنی تفصیل کے ساتھ پیش نہیں کیا تھا۔ اس لحاظ سے یقیناً مؤلف کی خدمت قابل قدر ہے لیکن ضرورت تھی کہ ان مباحث کو مولانا شبلی اور جسٹس امیر علی اور ان کے عہد کے لوگوں نے جہاں چھوڑا تھا، مؤلف اس مقام سے آگے بڑھتے اور زیادہ گہری نظر سے مسلمانوں کے علوم عقلیہ کا مطالعہ کر کے دنیا کو یہ بتلاتے کہ افکار انسانی کے نشوو ارتقا میں درہ اصل مسلمانوں کا حصہ کتنا اور کیسا ہے، اور وہ خاص اسلامی عنصر کونسا ہے جس نے فکر و نظر کے ہر گوشہ میں اپنا اثر ظاہر کیا۔ ایک مغربی مصنف (O'leary نے اس موضوع پر ایک کتاب Arabic Thought And Its Place In History کے نام سے لکھی ہے، مگر وہ غریب خود فکر اسلامی سے ناآشنا تھا۔ اس لیے وہ اس موضوع کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ یہ فرض درہ اصل مسلمانوں ہی کے ذمہ واجب الادا ہے، اور اس سے وہی لوگ اچھی طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں جنہوں نے علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ دونوں کی تعلیم حاصل کی ہے۔

کتاب میں چند باتیں اصلاح طلب بھی ہیں جن پر امید ہے کہ دوسری اشاعت کے موقع پر نظر ثانی کی جائے گی۔

قرآن مجید میں جس چیز کو لفظ "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے وہ نہ تو انگریزی لفظ (Rationalism کی ہم معنی ہے اور نہ (Free thinking کی۔ انیسویں صدی کے مسلمان مصنفوں نے محض اشتراک لفظی سے فائدہ اٹھا کر قرآن کی حکمت کو حکمت بمعنی جدید سے ملا دینے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اس وقت کی بات تھی جب ہماری جدید علمی تحریک اپنے عہد طفولیت سے گذر رہی تھی۔ اب نسبتہً بلوغ کا زمانہ ہے اور ہمارے محققین کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اپنے استدلال کی عمارت ایسی کمزور بنیادوں پر اٹھائیں۔

اعتزال کے لیے (Rationalism) اور اشعریت کے لیے (Scholasticism) کی

اصطلاحیں بھی درست نہیں۔ انگریزی پڑھنے والوں کے ذہن ان اصطلاحوں سے جن مفہومات کی طرف منتقل ہوں گے وہ اعتزال اور اشعریت کی خصوصیات سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ فاضل مؤلف نے اعتزال اور اشعریت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے شبہ ہوتا ہے کہ انہوں نے خود بھی ان دونوں مذاہب کی حقیقت پر اچھی طرح غور نہیں کیا ہے، اور زیادہ تر مولٰنا شبلی مرحوم کی کتابوں پر اعتماد کرکے ایک رائے قائم کرلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے نہ صرف اصطلاحوں کے استعمال میں غلطی ہوئی ہے، بلکہ ان کے بیان کا پلڑا ہر جگہ اعتزال کی طرف جھک گیا ہے۔ وہ معتزلہ کو "مسلمان مفکرین کا سب سے زیادہ ریشنلسٹ گروہ" سمجھتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں اشعریت کو ایک ارتجاعی (Reactionary) تحریک قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اعتزال ہمیشہ خام فلسفیت سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو اعتزال رونما ہوا وہ بھی دراصل خام فلسفیت ہی کا نتیجہ تھا۔ جب تک مسلمانوں میں عقلیات کا مطالعہ محض سطحی رہا اور تنقید کا مادہ پیدا نہ ہوا اس وقت تک علم کلام میں اعتزال کا اور فلسفہ و طبیعیات میں حکمائے یونان سے مرعوبیت کا دور دورہ رہا۔ مگر جب چوتھی اور پانچویں صدی میں بلوغ کا عہد آیا اور زیادہ گہری نظر رکھنے والے مفکرین پیدا ہوئے تو انہوں نے کلام اور فلسفہ اور منطق پر تنقید شروع کردی اور ایک ایک کرکے ان غلطیوں کے پردے چاک کرنے شروع کردیئے جو ابتدائی دور کے متکلمین اور حکمار نے کی تھیں۔ اشعریت اس دور تنقید کی محض ایک ابتدائی چیز تھی اس لیئے خام نظر آتی ہے۔ آگے چلکر امام غزالی امام رازی، علامہ ابن تیمیہ اور دوسرے لوگوں نے جب عقلیات اسلامی کو کمال پر پہونچایا تو اعتزال طبیعی موت مرگیا اور اشعریت کی صورت بدل کر کچھ سے کچھ ہوگئی۔

مؤلف نے ایک طرف تو اعتزال کو "ریشنلزم" کا ہم معنی قرار دیا ہے، اور دوسری طرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "ریشنلزم" کی روح خود صحابہ اور تابعین کے گروہ میں پیدا ہو چکی تھی۔ اس سے ایک شخص یہ دہوکا کھا سکتا ہے کہ صحابۂ کرام اور تابعین میں بھی کچھ لوگ اعتزال کی طرف میلان رکھتے تھے، حالانکہ

یہ بالکل غلط ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ کے متعلق مؤلف نے وثوق کے ساتھ لکھدیا ہے کہ وہ معراج جسمانی کی قائل نہ تھیں حالانکہ یہ کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں۔ ابن ہشام نے اس روایت کو محمد بن اسحاق سے لیا ہے اور محمد بن اسحاق نے اپنے ذریعۂ علم کی تصریح نہیں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے خاندان ابوبکر کے کسی شخص نے ایسا کہا تھا۔ مگر ان کا زمانہ حضرت عائشہ سے اس قدر بعید ہے کہ خاندان ابوبکر کے جس شخص نے بھی ان سے یہ روایت بیان کی ہوگی وہ بہرحال ایسا شخص نہ ہوگا جس نے ام المومنین کی صحبت پائی ہو۔ لہٰذا اس کے اور حضرت عائشہ کے درمیان ایک واسطہ اور چھوٹ جاتا ہے۔ پس یہ روایت ایسی ہے جس کا ایک راوی بیچ سے غائب ہے اور ایک راوی مجہول ہے۔ کیا ایسی کمزور روایت کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ام المومنین کا یہی مسلک تھا؟ یہ دراصل انیسویں صدی کے معتزلہ کی خصوصیت تھی کہ وہ اپنے مسلک کی تائید میں ہر چھوٹے سے چھوٹے تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے معراج کے متعلق اپنا نظریہ پیش کیا تو یہ روایت ان کے ہاتھ لگی اور انہوں نے بہت غنیمت سمجھ کر اس کو لے لیا۔ مگر جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، وہ طفولیت کا زمانہ تھا بچپن کی باتیں اس وقت نبھ جاتی تھیں۔ اب اس دور بلوغ میں ارباب تحقیق کو زیب نہیں دیتا کہ ایسے کمزور سہاروں پر استدلال کی بنیاد اٹھائیں۔

قانون بین الممالک تالیف مولوی محمد حمید اللہ صاحب استاذ جامعۂ عثمانیہ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت عہ ۴ ر ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب بین الاقوامی قانون یا باصطلاح مؤلف "قانون بین الممالک" پر درسی اغراض کے لیے لکھی گئی ہے۔ مؤلف کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اردو کے لیے یہ موضوع بالکل نیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک شخص بین الاقوامی قانون کے شعبۂ جنگ پر تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہے۔

ہم کو سب سے زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ مولف نے اُن توقعات کو پورا کیا ہے جو ایک مسلمان محقق سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اہل یورپ نے بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب کا سبق مسلمانوں سے حاصل کیا اور ایک نہایت ترقی یافتہ بین الاقوامی قانون مرتب صورت میں ان سے پایا، مگر ان کی احسان فراموشی نے اتنی بھی اجازت نہ دی کہ وہ بین الاقوامی تعلقات کے نشوونما کی تاریخ میں کہیں مسلمانوں کے حصہ کا اشارۃً ہی اعتراف کرتے۔ اب یہ کام ایک مسلمان مصنف ہی کا ہو سکتا تھا کہ وہ اس موضوع پر کچھ لکھتے وقت اسلامی قوانین کو فراموش نہ کرتا۔ چنانچہ ہمیں مسرت ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب میں اس حقیقت کو اچھی طرح ظاہر کر دیا کہ موجودہ قانون بین الاقوام کے اصلی بانی مسلمان ہیں نہ کہ اہل یورپ، اور یہ کہ مسلمانوں کے پاس بین الاقوامی تعلقات کا ایک مکمل ضابطہ اس وقت موجود تھا جب یورپ میں اس کا تصور بھی پیدا نہ ہوا تھا۔

ایک بات خصوصیت کے ساتھ ہماری نظر میں کھٹکی اور وہ یہ ہے کہ مولف نے وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ کا ترجمہ "اور رام راج قائم ہو" کیا ہے۔ کیا "رام" لفظ اللہ کا ترجمہ ہے اور ایک مسلمان یہ ترجمہ کر سکتا ہے؟ اردو کو ہندی سے ملانے کی تحریک سیاسی حیثیت سے خواہ کتنی ہی مناسب ہو مگر اس کو اتنا نہ پھیلائیے کہ خدا اور اللہ کی جگہ "رام" لے لے۔

کتاب میں حیدرآباد کی بین الاقوامی حیثیت پر جو بحث کی گئی ہے وہ بڑی حد تک بے جوڑ محسوس ہوتی ہے بین الاقوامی قانون اس سے بحث نہیں کرتا کہ فلاں ملک کی پوزیشن کیا ہونی چاہیے تھی۔ بلکہ وہ صرف اس امر سے بحث کرتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں اس کی پوزیشن فی الواقع کیا ہے۔ مولف نے اس بحث میں پڑ کر اپنے حب وطن کا ثبوت تو ضرور دیا ہے، مگر جس فن پر وہ کلام کر رہے ہیں اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

ابن مریم [تالیف جناب خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب ایم اے پنشنر سشن جج۔ ۲۔ فرید کوٹ لاہور
ضخامت ۱۶۸ صفحات۔ قیمت عہ مولف سے اوپر کے پتے پر مل سکتی ہے۔

فاضل مؤلف نے اس سوال پر بحث کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور ان کی حیات وممات اور ان کے معجزات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس بحث میں انہوں نے قرآن سے باہر کی کسی چیز سے مدد نہیں لی ہے بلکہ صرف قرآن ہی کے الفاظ اور ان کے سیاق وسباق اور آیات کے نظم سے متنازع فیہ آیات کے معانی متعین کیے ہیں بحث بہت دلچسپ ہے اور ایک اچھے تربیت یافتہ قانونی دماغ سے جس سلجھے ہوئے طرز بیان و انداز استدلال کی ہم توقع رکھتے ہیں وہی اس میں ابتدا سے انتہا تک نمایاں نظر آتا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں مؤلف نے تفسیر و تاویل کے اصول پر بھی کلام کیا ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر فائدے سے خالی نہیں۔

حروف مقطعات کے اشارات وکنایات | تالیف جناب خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب ضخامت ۹۸ صفحات۔ قیمت ۸ر۔ مؤلف سے مذکورۂ بالا پتہ پر مل سکتی ہے۔

حروف مقطعات کا مسئلہ مفسرین قرآن کے لیے ہمیشہ سے ایک لاینحل مسئلہ رہا ہے۔ خدا اور رسول نے ان کی کوئی تاویل ہم کو نہیں بتائی اور خود ہم اپنی عقل سے اگر کوئی تاویل کریں تو ہمارے پاس یہ اطمینان کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ ہماری تاویل صحیح ہے اسی بنا پر جمہور نے سکوت ہی مناسب سمجھا ہے لیکن بعض مفسرین نے تاویل کی کوشش بھی کی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ تاویل کرنے والا اپنی تاویل کی یقینی صحت کا دعویٰ نہ کرے۔

حاجی رحیم بخش صاحب نے اس مختصر میں حروف مقطعات سے معنی نکالنے کا ایک عجیب طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ عربی حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے حروف کے اعداد معین کرتے ہیں مثلاً ص چودہواں حرف ہے اس لیے اس کا عدد ۱۴ ہے اور ق اکیسواں حرف ہے اس لئے اس کا عدد ۲۱ ہے۔ پھر جس سورۃ میں مثلاً حرف ص آیا ہے اس کے مضمون پر وہ نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں ایک مخالف اسلام گروہ کے شکست کھانے کی پیشین گوئی ملتی ہے (جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ) اس کے بعد وہ تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں

ہیں تو یہ واقعہ ملتا ہے کہ بعثت کے چودھویں سال جنگ بدر پیش آئی جس میں کفار کو شکست نصیب ہوئی۔ پھر ان تینوں حقیقتوں کے درمیان ربط پیدا کرکے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ سورہ ص کی ابتدا میں حروف تہجی کے چودھویں حرف یعنی ص کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ نے واقعہ بدر کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہی اسلوب انہوں نے تمام حروف مقطعات کے بارے میں اختیار کیا ہے اور ان سے آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں نکالی ہیں۔ ممکن ہے کہ قرآن کے بے شمار اعجازی پہلوؤں میں سے یہ بھی ایک پہلو ہو، مگر جیسا کہ مؤلف کو خود اعتراف ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی مراد حقیقتہً وہی تھی جو مؤلف نے سمجھی ہے۔

سلسلۂ تعلیم القرآن | تالیف مولوی محمد عماد الدین صاحب انصاری فاضل دیوبند قیمت حصہ اول ۴ر حصہ دوم ۴ر ملنے کا پتہ: کتب خانہ انصاریہ، بازار شیخاں جالندھر۔

یہ سلسلہ بچوں اور کم سواد لوگوں تک قرآن کی تعلیم پہنچانے کے لیے لکھا گیا ہے۔ ایک خاص ترتیب کے ساتھ قرآن کی آیات جمع کی گئی ہیں جن سے عقائد اور احکام اور اخلاقی تعلیمات پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے۔ ہر آیت کے نیچے عام فہم ترجمہ دیا گیا ہے۔ حاشیہ پر مضامین کی تشریح ہے اور کتاب کے آخر میں لغات قرآن کو حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب کرکے ان کے معنی درج کر دیے گئے ہیں۔

گلدستۂ تعلیم اسلام | تالیف مولوی محمد عماد الدین صاحب قیمت: قاعدہ ۱ر حصہ اول ۴ر حصہ دوم ۵ر حصہ سوم ۶ر، حصہ چہارم ۶ر ملنے کا پتہ وہی جو اوپر مذکور ہوا۔

یہ سلسلہ مسلمان بچوں کی تعلیم کے لیے لکھا گیا ہے۔ قاعدہ تو اسی طرز کا ہے جس پر قدیم قاعدے لکھے گئے ہیں بعد کی کتابوں میں اسلامی عقائد، سیرت نبوی، احوال صحابہ اور احکام فقہیہ کو ایک خاص ترتیب و تدریج کے ساتھ جمع کیا گیا ہے اور اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ بچہ جتنا جتنا بڑا ہوتا جائے اس کے سامنے دینی معلومات کی اتنی ہی زیادہ تفصیلات آتی جائیں۔ طریق تعلیم اچھا ہے، مگر زبان میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے جو کتابیں لکھی جائیں ان کی زبان صحیح ہونی چاہیے تاکہ دینی تعلیم کے ساتھ ان کی ادبی تعلیم بھی مکمل ہوتی جائے

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات وصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہو گی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیک نمبر اور نمبر خریداری اور چیز

اشاعت کے لیے مضامین و حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے

مینجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابو الاعلیٰ مودودی) (مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن)

اُردو زبان کی ایک پرشکوہ کتاب

تمدن عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء

کی ۶۰۰ صفحہ جامع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۴۵) امریکن بلاک (۱۵۱) صفحے اعلیٰ کاغذ کا
نفیس چھپائی، بہترین سنہری جلد فرانس کے مایۂ ناز مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی اصل کتاب کا ترجمہ

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بے مثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی مگر ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن (مدظلہ) کے

جشن سیمین کی شادمانی میں غرۂ ذی حجہ سنہ ۱۳۵۴ھ تک شائع ہو جائے گی

پیشگی رعایتی قیمت بیس روپئے بعد طبع پچیس روپئے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادر روزگار کتابوں سے منگوائیے

سید عبد القادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن کا (پتہ یاد رکھیں)